اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا شش ماہی ترجمان
نومبر ۲۰۱۴ء

اقبال ریویو

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، انڈیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کا ششماہی ترجمان

(نومبر ۲۰۱۴ء)

اقبال ریویو

زیر اہتمام

اقبال اکیڈیمی ، حیدرآباد ، انڈیا

جلد (۲۴) شمارہ (۲)

مجلس مشاورت

۱۔ جناب محمد ظہیر الدین احمد
(صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی' (لاہور)

مجلس ادارت

۱۔ جناب محمد ضیاء الدین نیر
(نائب صدر اقبال اکیڈیمی حیدرآباد)

۲۔ سید امتیاز الدین'
(معتمد اکیڈیمی وایڈیٹر)

بدل اشتراک

فی شمارہ ۷۵ روپے

ایک سال کے لیے (دو شمارے) ۱۵۰ روپے

بیرونِ ملک: فی شمارہ ۵ ڈالر یا متبادل رقم

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:

اقبال اکیڈیمی، گلشن خلیل: 10-5-7/1 تالاب ماں صاحبہ۔ حیدرآباد۔ 5000028

تلنگانہ (انڈیا)۔ فون۔ 23323950 ' 040-66663950

e-mail:ihfiqbalacademy@gmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ: ''سیف کمپیوٹر'' H.No.17-1-30-/7/2

عیدی بازار' سنتوش نگر' حیدرآباد۔ 500-059۔ فون: 9959572844

ISBNNO: 81- 86370- 63- 3

سید امتیاز الدین ایڈیٹر' پرنٹر و پبلشر نے۔ لیس کے' گرافکس حمایت نگر' حیدرآباد سے طبع کروا کر
اقبال اکیڈیمی حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

(اقبال ریویو۔نومبر ۲۰۱۴ء)

۱	اداریہ	ادارہ	۴
۲	علامہ اقبالؔ کا فلسفہ خودی	میر محمود علی قیصر	۶
۳	اقبالؔ کے شخصی مرثیے	سید فاروق حسین	۱۸
۴	اقبالؔ اور مسئلہ خودی	محمد جمیل احمد	۲۴
۵	دورِ حاضر کا فکری بحران اور اقبالؔ	محمد شمس الدین صدیقی	۳۴
۶	فکر اقبالؔ کے چند پہلو	غلام جیلانی برق	۴۰
۷	پیام اقبالؔ۔نوجوانوں کے نام	طاہر عثمانی	۴۵
۸	اقبالؔ، شاعری اور شخصیت کے آئینہ میں	سید غوث الدین	۵۰
۹	تلاشِ اقبالؔ	سید مصلح الدین سعدی	۵۵
۱۰	علامہ اقبالؔ کا تصور اتحاد	محمد طالب جلال ندوی	۷۹
۱۱	اقبالؔ کی شاعری	شمس الرحمٰن فاروقی	۹۰
۱۲	اپنی خودی پہچان	سید خلیل اللہ حسینی	۹۶
۱۳	خبرنامہ		۱۰۰

اداریہ

اقبال ریویو شاید ملک کا وہ واحد رسالہ ہے جو تمام کا تمام علامہ اقبالؔ کے افکار و خیالات، ان کے پیام اور محاسن شعری کا جایزہ لینے کے لیے نکالا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت میں اکثر تاخیر بھی ہوجاتی ہے کیونکہ مختلف النوع موضوعات پر مضامین حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے لیکن ایک ہی موضوع پر معیاری مضامین کا حصول مشکل ہے۔ ہم نئے ادیبوں کے ساتھ ساتھ کبھی مفکرین اور اقبال شناسوں کے فکر انگیز مضامین بھی شامل کرتے ہیں۔ موجودہ شمارہ جو اقبال کے یوم پیدائش کے موقع پر شایع ہورہا ہے قدیم و جدید مضامین کے امتزاج سے مزّین ہے۔ اقبال اور غالب ہماری شاعری کے وہ شمس و قمر ہیں جن کے اشعار ہمیشہ دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ہر دور اُن کو اپنا ہم عصر سمجھتا ہے اور ہر عصر کی ترجمانی ان کے کلام میں ہمیں ملتی ہے۔

اقبالؔ کے فلسفۂ خودی پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اسے پوری طرح سمجھنا دشوار لگتا ہے۔ ہر مبصر اپنے طور پر اس کی تفہیم کرتا ہے۔ اس شمارے میں دو بہترین مضامین اس موضوع پر شامل ہیں۔ محمود علی قیصر اور محمد جمیل احمد نے اِس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ دونوں نے اقبال کے کلام کی مدد سے توضیحات پیش کی ہیں اور دونوں ہی نے بڑی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے اس اہم موضوع کو واضح کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب موضوع ایک ہو تو کہیں کہیں نمونہ اشعار میں تکرار آجاتی ہے لیکن دونوں مضامین مبصرین کے زاویۂ نگاہ کو بڑی خوبی سے قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

سید فاروق حسین کا مضمون 'اقبال کے شخصی مرثیے' ایک بالکل نئے طرز کا مضمون ہے۔ اقبال فطری طور پر رجائی شاعر تھے۔ اگر وہ کوئی نظم افسوس کے لہجے میں شروع کرتے تھے تو اس کا اختتام رجائی اور امید افزاء ہوتا تھا۔ اس لیے مرحومین پر اُن کی نظموں کو مرثیے کی بجائے خراجِ عقیدت کہا جاسکتا ہے۔ لیکن سید فاروق حسین کی ایک اچھی کوشش ہے کہ انھوں نے اقبال کی ایسی نظموں کو اکٹھا کیا اور شاعر کے اسلوب اور بیان کا خوبی سے جائزہ لیا ہے۔

غلام جیلانی برق کا مضمون فکرِ اقبال کے چند پہلو شاعرِ مشرق کی فکر کے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے اور ہمیں اس کی ہمہ گیری سے روشناس کراتا ہے۔ نوجوان اقبال کی امیدوں کا مرکز تھے۔ آج کی نئی نسل بھی اقبال کے کلام اور پیام سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ اس تناظر میں طاہر عثمانی کا مضمون وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اقبال شاعری اور شخصیت کے آئینے میں سید غوث الدین کا فکر انگیز مضمون ہے۔ مصلح الدین سعدی عالم آدمی تھے اور ان کا مطالعہ اقبال بہت وسیع تھا۔ تلاشِ اقبال سعدی صاحب کے تبرکات میں شمار ہوگا اور اقبال شناسوں کے لیے مشعلِ راہ بھی۔

ہمیں خوشی ہے کہ عہدِ حاضر کے ذہین ترین نقاد اور ہمہ جہت شخصیت شمس الرحمان فاروقی کا ایک عمدہ مضمون بھی اس شمارے کی زینت ہے اور آخر میں خلیل اللہ حسینی مرحوم کی ایک تحریر اپنی خودی پہچان ہم نہایت احترام سے شایع کر رہے ہیں۔ خلیل صاحب عاشقانِ اقبال میں سے تھے اور وہ کلامِ اقبال کو دل کی گہرائیوں سے سرمایہ تعمیرِ ملّت سمجھتے تھے۔

ہمیں امید ہے کہ اس بار ہمیشہ کی طرح متنوع مضامین کا یہ گلدستہ آپ کو پسند آئے گا۔

(ادارہ)

❁❁❁

میر محمود علی صاحب قیصرؔ

علاّمہ اقبال کا فلسفۂ خودی

نصف صدی قبل ہندوستان کی اسلامی فضاء میں ایک آواز گونجی تھی جس سے زمین و آسمان دہل گئے اس آواز کا منبع علیگڑھ تھا۔ سرسید احمد خان مرحوم نے اس شورِ قیامت کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا کہ ہندوستان کی اسلامی دنیا میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سرسید کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور ان کے مستقبل پر نظر کر کے سرسید کی زبان اور قلم، تنبّہ و تنبیہ، تدبّر و تدبیر کا تلاطم پیدا کر رہے تھے۔ پہلا شخص جس نے سرسیّد کے پیغام کو شعر کے سانچے میں ڈھالا وہ حالیؔ تھا۔ حالیؔ نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے دردمند دل کے ساتھ اس کی داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور حالیؔ اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا۔ لیکن سرسیّد کا پیغام ابھی اجمالی تھا۔ حالیؔ نے مسلمانوں کی مرعوبی اور مایوسی کے طلسم کو توڑا اور ان میں خودداری اور خوداعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور ان کے مستقبل کا تعین کیا۔ اس مستقبل کی ابھی تشریح اور تفصیل باقی تھی۔ وہ شخص نے اس اجمال کی تفصیل کی اور جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا وہ ڈاکٹر اقبالؔ تھے۔ یعنی حالیؔ ہمارے حال کا شاعر تھا اور اقبالؔ ہمارے مستقبل کے شاعر ہیں۔

مشہور فارسی شاعر حضرت گرامیؔ مرحوم نے علاّمہ اقبالؔ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ ؎

دردیدۂ معنی نگران حضرتِ اقبالؔ پیغمبری کردو پیمبر نتوان گفت

اقبالؔ کی شاعری فلسفیانہ شاعری ہے۔ یہہ خیال ہر متنفّس کے ذہن میں اُلجھن پیدا کرتا ہے کہ بھلا فلسفہ، شعر کیونکر ہوسکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ تو حقیقت کی خشک اور بے جان تعبیر ہے اور شعر اس کی زندگی سے چھلکتی ہوئی تفسیر۔ فلسفی صورتِ کائنات کا ذہنی ادراک کرتا ہے اور اپنے اور اکات کو مجرد تصورات میں بیان کردیتا ہے جو ہماری لوحِ فکر پر مندرج ہوجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے شاعر نبض

کائنات کی تڑپ، قلبِ حیات کی دھڑکن محسوس کرتا ہے اور اپنے احساسات اور مشاہدات کو متحرک نقش اور نغمہ میں ادا کرتا ہے۔ لہٰذا اقبالؔ کے شعر کو فلسفیانہ شعر کہنے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ حکمت اور فلسفہ کے نظریات کی طرح سوز و درد، زندگی و حرکت سے خالی ہے۔ لیکن علاّمہ موصوف کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کی شاعری آبِ حیات کا خزانہ ہے اور علاّمہ کی شاعری سے زندگی اور زندہ دلی کے چشمے اُبلتے ہیں جس سے سیراب ہوکر مایوس دلوں کی خشک اور بنجر زمین میں جان پڑ جاتی ہے اور امیدوں اور تمناؤں کی کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں۔ علاّمہ اقبالؔ ایک جادو نگار اور سحر طراز شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند فکر فلسفی اور روشن خیال مفکّر بھی۔

ان کی ذات مغربی اور مشرقی علوم وفنون اور روایات کا بہترین امتزاج تھی یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ علاّمہ اقبالؔ کی ہستی مجموعہ البحرین تھی۔ وہ اپنے ساتھ ایک عظیم تر پیام لائے تھے اور اِسی کو عمر کے آخری لمحے تک گوش گذار کرتے رہے۔ ان کی شاعری جز دیست از پیغمبری بن جاتی ہے جہاں شاعر اپنی ذات کو خلاّق عالم کی ذات میں اس درجہ فنا کر دیتا ہے کہ وہ اُس سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل کر لیتا ہے۔

علاّمہ اقبالؔ ''خودی'' کے زبردست علمبردار اور پیامبر تھے چنانچہ فلسفہ خودی کی توضیحات و تشریحات سے قبل ہم یہ بتلائیں گے کہ علاّمہؒ نے خودی کا لفظ کن معنوں میں استعمال فرمایا ہے اسرار خودی کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ ''خودی کا لفظ بہ معنی غرور اِستعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے اس کا مفہوم صرف احساسِ نفس یا تعیّن ذات ہے'' یہی خودی کا تصور اقبالؔ کے فلسفہ حیات و کائنات کی بنیاد ہے۔

خودی سے اقبالؔ کی مراد یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ خودی کے ذریعہ خدا تک پہنچنا ممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اِنسان اُس بحرِ عظیم کا ایک قطرہ ہے جسے ہم خدا کے نام سے منسوب کرتے ہیں لیکن قطرہ اپنی ذات کے اسرار و رموز کو نہ پا جائے اور خود اپنی ہستی کو قابل قدر نہ جانے وہ بحرِ عظیم کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ انسان خدا کی ذات کا پرتو ہے یا یہ کہئے کہ خدا اِنسان کی ذات میں جلوہ گر ہے۔ پس اگر اِنسان اپنی حقیقت کو جان لے تو اُس سے خدا کو کما حقہ پہچان

سکتا ہے۔ جس کے جمال کا جلوہ خود اِنسان کی ہستی ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک خودی کی موت اِنسان کی موت ہے اور جہاں اِنسان اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے تو گویا وہ ساری کائنات سے منہ موڑ لیتا ہے' خودی کا کمال اِنسانی کمال ہے اور اس کا زوال اِنسانی زوال ہے خودی کا انکار اقبال کے نزدیک سب سے بڑا کفر ہے چنانچہ فرماتے ہیں ۔

منکرِ حق نزد مُلّا کافر است منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

اِنسان کی بقاء کا راز خودی میں مضمر ہے جب قوم کے افراد اپنی خودی کو نہیں پہچانتے اور اس کی قدر نہیں کرتے تو وہ قوم انحطاط اور ادبار کے تاریک غار میں گر جاتی ہے اور اس کی عملی اور دماغی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ خودی کے تعین سے اگر اجتماعی نظام' سماجی مسائل' ادب و دین بیگانہ ہوں تو جماعت تنزّل پذیر ہو جاتی ہے ۔

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دین ہوئے ہیں بیگانہ

اقبالؔ عشق کو اِنسانی کمال کے لئے لازمی وضروری سمجھتے ہیں ان کا یہ ایمان ہے کہ عشق کے بغیر کوئی قوم ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتی۔ عشق ہی سے خودی کی تخلیق ہے اور خودی میں اس وقت تک زندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس میں عشق اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر نہ ہو۔ مختصراً یہ کہ عشق اور خودی لازم وملزوم ہیں جب خودی اپنے کمال پر پہنچتی ہے تو عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

علاّمہ اقبالؔ نے کبھی عقل کو اپنا پیشوا اور رہبر تسلیم نہیں کیا کہ عقل دل میں یقین وایمان پیدا کرنے کے بجائے شک وشبہ پیدا کرتی ہے۔ لیکن عشق جذبِ اندرون اور بیباکی پیدا کرتا ہے اور یہ عشق اس لائق ہے کہ اِنسان اِسے اپنا رہنما قرار دے چنانچہ فرماتے ہیں ۔

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق استِ امامِ من عقل است غلامِ من

اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اپنے فکر کے خزانوں کو شاعری کے قالب میں پیش کیا اس حکیم

عصر نے مشرق کی مردہ قوموں میں حیاتِ تازہ پیدا کرنے کے لئے ''فلسفۂ خودی'' کو اپنے اثر آفریں انداز میں پیش کیا کہ ان کے منجملہ رگوں میں خون حرکت کرنے لگا۔ غلط تصوف' اور افلاطون کی کورانہ تقلید اور ملائی کے اثر نے شاعروں' ادیبوں فلسفیوں سب کو عمل سے بیزار اور دست کش بنا دیا تھا اقبال نے انہیں از سرِ نو یہ درس دیا کہ اِنسان کی خلقت کا مقصد یہی ہے کہ وہ اپنی خودی کو مستحکم بنائے اور اسی کے ذریعہ فطرت کو تسخیر کرے۔

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت تعمیر خودی میں ہے خود نمائی

اقبالؔ کے نزدیک کائنات کی اصل ایک وجودِ بسیط ہے جس کے اندر شعور اور ارادہ کی قوتیں مضمر ہیں۔ اِن قوتوں کو فعل میں لانے کے لئے اِس نے اپنے آپ کو خود اور غیر خود میں تقسیم کر دیا ہے۔ غیر خود کی عِلّت خالی یہ ہے کہ وہ خودی کے مشاہدے کے لئے آئینہ کا اور اس کے عمل ارتقاء کے لئے معمول کا کام دے۔ خودی اپنی تکمیل اور استحکام کے لئے غیر خود سے ٹکراتی ہے اور اس تصادم کے ذریعہ سے اس کی اندرونی قوتیں نشو ونما پاتی ہیں اور وہ بتدریج سلسلہ ارتقاء کو طے کرتی ہے اس کی ہستیِ مسلسل حرکت اور عمل پیہم کشمکش ہے جس نسبت سے کوئی شئے اپنی خودی میں مستحکم اور غیر خود پر غالب ہے اُسی نسبت سے اس کا درجہ مدارجِ حیات میں متعین ہوتا ہے۔

پیکر ہستی ز آثارِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن راچوں خودی بیدار کرد آشکارا عالمِ پندار کرد
صد حجابان پوشیدہ اندر ذاتِ اد غیراو پیدا ست از اثباتِ است
چوں زمین بر ہستی خود محکم است ماہ پابندِ طواف پیہم است
ہستی مہراز زمین محکم تر است پس زمین مسحور چشمِ خاور است

اس سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی حیوان ناطق ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیاتِ
خودی کیا ہے بیدارئ کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اُس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دھارے ہیں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے

مخلوقات میں اعتبار مدارج انسان سب سے برتر اس لئے ہے کہ اس کی ذات میں خودی کو اپنا اور اپنے مقصد کو شعورِ اصلی حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح اِنسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اپنی خودی کا شعور ہے اِسی طرح اس کی منزل مقصود یہ ہے کہ خودی کو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر اور مستحکم سے مستحکم تر کرتا جائے۔ خودی کے منازل ترقی اس عالمِ رنگ و بو کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتے بلکہ شاعر کی چشمِ تخیل اِنسان کے جدوجہد عمل کے لئے اس کے ماوراء نئے نئے میدان تلاش کرتی ہے۔

خودی کی یہہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے
تیری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تُجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جایہ کوہِ گران توڑ کر
طلسمِ زمان و مکان توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر ایک منتظر تیری مینار کا
تِر ی شوخی فکر و کردار کا

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

دنیا کے ہر اعلیٰ منصوبے کی تکمیل کے لئے جس طرح ایک رہنما ضروری اور لابدی ہے اِسی طرح خودی کی تکمیل کا رہنما عشق ہے۔ عشق اس مردِ کامل کی محبت کو کہتے ہیں جو معرفتِ نفس کے مدارج' سے گذر کر خودی کی معراج پر پہنچ چکا ہے۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرا ر زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر ' سوز ند تر پائندہ تر

فانی اِنسان کی خودی کی تکمیل کر کے ایک لافانی نصب العین کی محبت اُسے بھی لازوال بنا دیتی ہے۔

مردِ خدا کا عمل عشق ہے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

تُند و سُبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سبیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

عشق کی تقدیم میں عصرِ رواں کے سِوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

فقر اور استغناء خودی کی ایک اہم ترین شرط ہے۔ مال و دولت' جاہ و منصب کے لئے اربابِ اقتدار کا دستِ نگر ہونا خودی کو فنا کر دیتا ہے لیکن طلبِ ہدایت کے لئے کسی مردِ کامل کے سامنے سرِ نیاز خم کرنا خودی کو مستحکم کرتا ہے۔ یہاں پر گدائی اور فقر کے فرق کی تشریح غیر ضروری نہ ہوگی۔ ان دو میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گدائی مال و دنیا کے لئے صاحبِ تموّل کے سامنے دستِ نگر ہوتا ہے اور فقر مادی لذتوں سے بے نیاز ہو کر کائنات کی قوتوں کو مسخر کرتا' تو ہمیں فطرت پر حکومت کرنا اور دنیا میں امن و انصاف کا ڈنکہ بجانا ہے۔

چیست فقرائے بندگانِ آب و گل
یک نگاہِ راہ میں یک زندہ دل
فقر خیبر گیر یا نانِ شعیر
بستۂ فتراک اوسلطان و میر
با سلاطیں برفتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد و سریر
فقر بَر کرد بیان شبخون زند
بر نو اسیس جہان شبخون زند
آرزوئے ماز استغنائے اوست
سوزِ ما از شوق بے پروائے اوست
ایک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
ایک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
ایک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
ایک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پر تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

جب خودی، عشق و محبت، فقر و استغناء سے محکم ہو جاتی ہے تو کائنات کی ساری قوتیں اِنسان کے قبضہ میں آجاتی ہیں۔

از محبت چوں خودی محکم شود قوتش فرماں دہِ عالم شود
پنجہ ٔ او پنجہ ٔ حق می شود ماہ از انگشت اوشق می شود

خودی کی غیر محدود قوتِ تعمیر و تخریب دونوں کا کام کر سکتی ہے۔ خودی سے تعمیر کا کام لینے کے لئے توسیع کے ساتھ ساتھ تربیت و تادیب ضروری ہے۔ خودی کی تادیب و تربیت کا پہلا درجہ اطاعت ہے یعنی قانونِ حیات کی پابندی جو خالقِ عالم نے ہر مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے۔

ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند
خویش را زنجیری آئین کند
بادرازند انِ گل خوشبو کند
قید بورا ناقۂ آہو کند
قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل
ذرّہ ہا صحرا ست از آئینِ وصل
شکوہ سنج سختیِ آئین مشو
از حدودِ زندگی بیروں مشو

دوسرا درجہ ضبطِ نفس ہے۔ نفس کی ادنیٰ قوتوں پر اِنسان کو قابو پانا چاہیئے۔ اولیں نفسیاتی محبت اور خوف کے جذبات پر جو سب سے زیادہ قوی ہیں غالب آئے۔

نفس تو مثلِ شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سر است

طرح تعمیر تو از گلِ ریختند
با محبت خوف را آمیختند
خوفِ دُنیا ، خوفِ عقبیٰ ، خوفِ جان
خوفِ آلامِ زمین و آسمان
تا عطائے لا اِلہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

ان ہر دو مدارج سے گذرنے کے بعد انسان اس درجہ پر فائز ہوتا ہے جسے اِنسانیت کا اوج کمال کہنا چاہئے یہ نیابتِ الٰہی کا درجہ ہے اور اس کا حصول ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائبِ حق ہم چوجانِ عالم است
ہستی ٔ اَوظلِ اسم اعظم است
کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہان سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اِس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکار حق مردِ خدا کا یقین
ورنہ یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز

عشق کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ　　حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

علاّمہ اقبالؔ قطرہ دریا کی تمثیل سے فرد وملت کے رشتہ کو ظاہر کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ قطرے کو دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہوتی بلکہ اور مستحکم ہو جاتی ہے وہ بلند اور درستی مقصد سے آشنا ہو جاتا ہے اس کی خودی پائیدار اور لازوال ہو جاتی ہے۔

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

فرد قائم ربط مِلّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں بیرون دریا کچھ نہیں

خالص فلسفیانہ نظریئے کی حیثیت سے اِنسانیت کا ایک عالمگیر تصور ممکن ہے اور اس تصویر کو زندہ نصب العین کی صورت میں صرف آئینہ مِلّت بیضارے اسلام ہی میں دیکھا جا سکتا ہے ان کے نزدیک انسان کی خودی کی حقیقی تکمیل اور فرد وملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعہ ممکن ہے کیونکہ اسلام میں فرد ملت کا رشتہ اتحاد، نسل یا وطن کا محدود تصور نہیں بلکہ توحید ورسالت کا وسیع، ہمہ آفاق عقیدہ ہے۔

با وطن وابستہ تقدیر اُمم
بر نسب بنیاد تعمیر اُمم

اصل ملّت در وطن دیدن کہ چہ
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

لاَ اِلٰہ سرمایۂ اسرارِ ما
رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

مِلّت بیضا تن وجان لاَ اِلٰہ
ساز مارا پردہ گردان لاَ اِلٰہ

اُمّتے ام ما سوا بیگانہ بر چراغِ مصطفٰے پروانہ
نا شکیب ِ امتیاز ات آمدہ درنہاد او مساوات آمدہ
پیش قرآن بندہ و مولیٰ یکے است بوریا ومسند دیبا ایکے است

خودی کی تکمیل کے لئے نفس زمان ومکان کے قیود سے آزادی ضروری ہے اور یہ بھی ملّت اِسلامی کے اندر ہے کیونکہ یہ زمان ومکان کے حدود سے بالاتر ہے اس کی بنیاد نسل ووطن پر نہیں بلکہ توحید ورسالت پر ہے کیونکہ نسل ووطن فنا ہو سکتے ہیں لیکن رشتہ کلمہ توحید لافانی ہے۔

جو ہر ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست
عقدۂ قومیّتِ مُسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد
بر اساس کلمہ ٔ تعمیر کرد

علم اشیاء بھی معرفتِ نفس کے لئے خودی کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کیونکہ انسان علم کی مدد سے خارجی ماحول پر غالب آتا ہے۔

ہر کہ محسوسات راتسخیر کرد
عالمے از ذرّہ تعمیر کرد
کوہ وصحرا' دشت ودریا' بحر وبر
تختۂ تعلیم ارباب نظر
غایتش توسیع ذات مسلم است
اِمتحان ممکنات مسلم است

علم اشیاء اعتبار آدم است
حکمت اشیاء حصار آدم است

اِنسان اپنے ارتقاء میں خودی کے مراحل کی تکمیل کے بعد عشق حقیقی کی منزل پر آتا ہے جس میں طالب ومطلوب کے اندر اس طرح فنا ہو جانا چاہتا ہے جس طرح قطرہ دریا میں۔ لیکن علاّمہ اقبالؔ علیہ الرحمہ قطرہ کی دریا میں فنائیت اس طرح چاہتے ہیں کہ وصل کے بعد قطرہ کا انفرادی وجود نہ مٹے یہی وہ مقام ہے جہاں قطرہ اپنی ذات کے اسرار ورموز پا کر اور خود اپنی ہستی کو قابل قدر جان کر بحرِ عظیم کی حقیقت سمجھتا ہے اور انسان اپنی حقیقت کو جان کر خدا کو کما حقہ پہچان جاتا ہے جس کے جمال کا جلوہ خود اِنسان کی ہستی ہے اقبال کے نزدیک خودی کی موت انسان کی موت ہے اور خودی کا کمال انسانی کمال ہے۔

اقبال نے اسلامی تعلیم سے متاثر ہو کر یہ کہا کہ انسان کا اخلاقی نصب العین اثباتِ خودی میں مضمر ہے اور وہ انسان کی خودی کو اس بلند درجہ پر دیکھنا چاہتے ہیں جہاں خود خدا انسان کی خودی کو لائقِ اعتناء سمجھے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ڈاکٹر اقبالؔ دنیا کے ایک بہت بڑے اِنسان، دورِ حاضر کے ایک بلند پایہ حکیم وفلسفی، پیغمبرِ خودی اِنسانوں کو آداب جنون وخود آگاہی سکھانے والے غلاموں کو اسرار فقر وشہنشاہی سمجھانے والے، حقیقت کے ترجمان اور اِنسانیت کے معلّم تھے۔ اگر لوگ ان لرزہ خیز حقائق کو صرف دور سے دیکھنے کی بھی تاب نہیں رکھتے یا ان کی سختی ناگوار گزرتی ہے تو اس آئینہ کو قصوروار قرار دینا انصاف نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ گندی کیچڑ کے دریا میں آنکھیں بند کر کے اپنی خوبصورت کشتی دیکھنے کی مضحکہ خیز کوشش کرتے رہیں اور زندگی سے گریز کا سبق سکھاتے رہیں۔

❁❁❁

سید فاروق حسین

اقبال کے شخصی مرثیے

مرثیے کے لغوی معنی' بزرگوں اور عزیزوں کی موت پر اظہار افسوس کرنا اور ان کی نیکیاں اور خوبیاں یاد کرنا' یعنی مرثیے بزرگوں اور اکابرین قوم وملت کی وفات پر بھی کہے جاتے ہیں اور عزیزوں' دوستوں اور خاندان کے افراد کی موت پر بھی۔ مگر اردو ادب میں ''مرثیہ'' اصطلاحی معنوں میں صرف اس نظم کو کہتے ہیں جس میں شہیدان کربلا کے مصائب کا ذکر اور ان کی شہادت پر اظہار غم کیا گیا ہو پروفیسر مسعود حسین رضوی مرحوم کا ارشاد ہے۔

''مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اس کی موت پر افسوس کیا جائے اور بالخصوص مرثیئے کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں امام حسینؑ کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرائے میں بیان کیا جائے یعنی مرثیئے کا ایک مفہوم عام ہے اور دوسرا خاص لفظ مرثیہ جب بغیر کسی تخصیص کے استعمال ہوتا ہے تو اس سے اکثر یہی خاص مفہوم مقصود ہوتا ہے۔[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں مرثیہ ابتداء ہی سے شہدائے کربلا کے واقعات شہادت اور شرح مصائب کے لئے مخصوص ہوگیا۔ معدودے چند شعرائے قدیم نے اپنے عزیزوں کی وفات پر بھی مرثیے کہے۔ میر جعفر ٹوٹلی نے اورنگ زیب کی وفات پر مرثیہ کہا۔

غالبؔ نے اپنے منفرد انداز میں زین العابدین خان عارف کی وفات پر غزل کی ہیئت میں پانچ قطعہ بند اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ نظم کیا اور مومن خاں مومنؔ نے بھی غزل کی صورت میں اپنے محبوب کی وفات پر مرثیہ لکھا۔ ایسے مرثیوں کے لئے جو واقعات کربلا اور شہدائے کربلا کہ متعلق نہ ہوں بلکہ بزرگوں عزیزوں اور دوستوں وغیرہ کی وفات پر کہے گئے ہوں' شخصی مرثیہ کی اصطلاح استعمال ہوجاتی ہے فارسی کے مشہور ادیب ''زین العابدین موتمن نے فارسی مرثیوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

[1] روح انیس ۲۰

''رثا یا دوبارۂ سلاطین و اکابر قوم است دیا دو مرگ خویشان د بستگان و دوستان نزدیک یا دور ذکر مصائب ائمہ اظہار و شہدائے واقعہ کربلا پس رثا ؤ سہ قسم منحصر می شود رثاء تشریفاتی و رسمی، رثاء شخصی و خانوادگی، رثاوِ مذہبی۔

جدید شاعری کے پیش روکی حیثیت سے مولانا حالؔی نے مرثیہ کی اصلاح ترقی کے لئے بھی مفید مشورے دیئے ہیں اور شخصی مرثیے کی طرف متوجہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

''قوم میں سے جب کوئی قوم کا محسن اور خدمت گذار گذر جائے تو شعراء جو قوم کی زبان ہیں تمام قوم کی طرف سے اس کے مرثیے لکھیں تا کہ معلوم ہو کہ قوم اپنے محسنوں کی قدر کرتی ہے اور اس میں ہمدردی کی رمق باقی ہے۔[۱]

حالؔی کی اس صدا پر لبیک کہا گیا اور انیسویں صدی کے اواخر سے اردو میں شخصی مرثیے خاصی تعداد میں کہے جانے لگے۔ علامہ اقبال شاعر ہی نہیں فلسفی اور مفکر بھی تھے شاعری سے انہوں نے پیغام بری کا کام لیا ہے اور اپنے پیغام کو شاعری پر مقدم رکھا ہے وہ ایک عظیم فن کار تھے ان کے نگار خانے میں پہنچ کر شعر کی صورت نکھر گئی انہوں نے مختلف اصناف سخن کو اپنے جذبات کی ترجمانی کے لئے جس طرح چاہا استعمال کیا وہ مذہب شعر کے مجدد اور مجتہد تھے مقلد نہیں۔ انہوں نے شخصی مرثیے بھی لکھے اور ان میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہؔر کی وفات پر اپنے جذبات کا اظہار کیا تو ان کے بیت المقدس میں دفن ہونے پر یہ نکتہ پیدا کیا کہ

سوئے داور رفت زاں راہے کہ پیغمبرؐ گذشت

اقبال کے شخصی مرثیوں میں حسب ذیل نظمیں شامل کی جا سکتی ہیں۔

''داغ''، ''فاطمہ بنت عبداللہ''، ''شبلی و حالؔی'، والدہ مرحومہ کی یاد میں' ''ہمایوں'' اور ''مسعود مرحوم''۔

داغؔ کے مرثیئے کے سوا ان میں سے کوئی نظم عام شخصی مرثیوں کے دائرے میں نہیں آتی کیوں کہ باقی نظموں کا طرز شخصی مرثیہ سے الگ ہے۔ انہیں عام شخصی مرثیوں کی صف میں صرف اس لئے

۱۔ شعر وادب فارسی صفحہ

۲۔ مقالاتِ حالی جلد دوم

شامل کیا جاسکتا ہے کہ یہ نظمیں کسی نہ کسی کی موت سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہیں۔ اقبالؔ حکیم الامت تھے فلسفہ ان کی طبیعت کا جزو اعظم تھا چنانچہ ان کے شخصی مرثیوں میں بھی فلسفہ کی کارفرمائی حیات وکائنات کے مسائل کی تشریح وتعبیر کی شکل میں موجود ہے۔

اقبالؔ نے اپنا ابتدائی کلام داغ کو دکھایا تھا گو یہ سلسلہ تلمذ زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہا مگر تعلق خاطر قائم تھا اسی لئے داغؔ کی وفات پر اقبالؔ نے ایک پراثر مرثیہ لکھا۔ جس میں اظہار غم کے ساتھ ساتھ داغؔ کے شاعرانہ کمالات بھی بیان کئے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

بلبل دلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں — ہم نوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کے جہاں
چل بسا داغؔ آہ میّت اس کی زیب دوش ہے — آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے
اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیٔ طرز بیاں — آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت — ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعمیریں بہت
ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویریں کون — اٹھ گیا نازک فگن مارے گا دل پر تیر کون

علامہ اقبالؔ نے جواز مرگ ترسی اے زندہ جاوید۔ مرگ ست عقیدے تورکمنی کے قائل تھے۔ داغ کے مرثیئے میں فلسفہ موت پر یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔

آرزو کہ خون رلواتی ہے بیدادِ اجل — مارتا ہے تیر تاریکی میں صبا و اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زباں — ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستاں
ایک ہی قانون عالم گیر کے ہیں سب اثر — بوئے گل کا باغ سے گل چیں کا دنیا سے سفر

۱۹۱۲ء میں اطالوی درندوں نے طرابلس میں قتل وغارت گری کا ایک حشر برپا کردیا تھا بے سرو سامان مجاہدین نے بے مثال پامردی سے لڑے اس جنگ میں ایک عرب گھرانے کی چشم وچراغ فاطمہ بنت عبداللہ غازیان اسلام کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوگئی۔ علامہ اس کی شہادت پر تڑپ اٹھے اور غم فخر کے ملے جلے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے چند پردرد اشعار نظم کئے۔

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی غازیان دیں کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اقبالؔ اپنی قوم کے تابناک مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ان کے نزدیک ایک لڑکی کے ایثار اور جوش عمل کا یہ مظاہرہ ثابت کر دیتا ہے کہ قوم میں سرفروشوں کا کال نہیں بلکہ وہ پرامید ہیں کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی زرخیز ہے ساقی' چنانچہ فرماتے ہیں۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبال قوم کے دیدۂ ور تھے وہ دیکھ رہے تھے کہ فاطمہ بنت عبداللہ کی قربانی سے حوصلہ پا کر قوم ایک نئی قوت کے ساتھ ابھرنے والی ہے فرماتے ہیں۔

ہیں فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ ترے غم میں ہے
نغمہ ٔعشرت بھی اپنے نالہ ٔ ماتم میں ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

اور دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ شاعرانہ تخیل نہیں تھا ایک قوم تازہ' وجود میں آئی اور اس نے اس سرزمین کو جس میں فاطمہ بنت عبداللہ آسودہ خواب ہے اطالوی استعمار پسندوں سے خالی کرالیا۔

شبلی و حالی کا مرثیہ انھوں نے بالکل نئے انداز سے لکھا ہے۔ یہ ایک مکالمہ کی شکل میں ہے۔ اقبالؔ ''مسلم'' سے پوچھتے ہیں کہ تیرا ماضی تو بہت شاندار تھا۔اس باغ پر خزاں کیسے غالب آگئی۔ یہ سن کر وہ تڑپ گیا۔

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیت خزاں — اوراق ہوگئے شجر زندگی کے زرد
خاموش ہوگئے چمنستان کے راز دار — سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں — حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں اشعار کی ایک طویل نظم کہی ہے اس میں اظہارِ غم بھی ہے اور حکیمانہ اور نفسیاتی نکتوں کی تشریح وتوضیح بھی فرماتے ہیں۔

علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور — دنیوی اعزاز کی شوکت جوانی کا غرور
زندگی کی بادج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم — صحبت مادر میں طفل سادہ بن جاتے ہیں ہم

ماں کی شفقتوں کی یاد نہیں تڑپاتی ہے اور وہ ان کی خدمت میں اشکوں کے ذریعہ نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا — گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفتر میں تھی زریں ورق تیری حیات — تھی سراپا دین ودنیا کا سبق تیری حیات

اس نظم میں موت کا کرب اور محرومی وناکامی کی شدت سموئی ہوئی ہے۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار — کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
عمر بھر تیری محبت میری خدمت کر رہی — میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

موت وحیات کے فلسفہ پر روشنی ڈالنے کے بعد علامہ نے یہ دعا کی ہے۔

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا — نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے — سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

پانچ اشعار کی ایک مختصر نظم اقبال نے مسٹر جسٹس شاہ دین ہمایوں کی وفات پر کہی اور انہیں خراج

عقیدت پیش کرنیکے بعد آخر میں فرمایا۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

علامہ میر راس مسعود کو بہت محبوب تھے اور انہیں کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے تھے۔ سر مسعود کی اچانک وفات نے اقبالؔ کو بہت بے تاب کیا اور انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

رہی نہ آہ زمانے کے ہاتھ سے باقی وہ یاد گار کمالات احمد و محمود
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود
نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست نہ کہہ کے صبر معمائے موت کی ہے کشود
دے کہ عاشق دلبہار بود مگر سنگ است زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

اقبالؔ نے یہ شخصی مرثیے ان کے تاب ناک اور ہمیشہ فروزاں رہنے والے پیغام ہی کا ایک حصہ ہیں اور ان کی شاعری کا حصہ بن کر یہ شخصیتیں بھی ان کے کلام کی طرح زندۂ جاوید رہیں گی۔

❁❁❁

محمد جمیل احمد

اقبال اور مسئلہ خودی

اقبال کی شاعری کا ایک مہتم بالشان موضوع جس کی ابھی تک کوئی مکمل اور اطمینان بخش تشریح نہیں ہوسکی خودی ہے یہ موضوع اس قدر مشکل اور مبہم ہے کہ اس کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکا مختلف لوگوں نے اپنے اپنے نقطہ ہائے نگاہ سے اس پر قیاس آرائیاں کی ہیں، مگر وہ اس درجہ مبہم مختصر اور غیر مکمل ہیں کہ اس سے اصل مسئلہ کی تفہیم میں کوئی مدد نہیں ملتی، غرضکہ بالفاظ غالب۔ ع

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

خودی اور اس کا مفہوم:۔

ابھی تک دنیا نے جو ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر آفاقی (یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی و مادی) دنیا کی اشیا کے خواص وصفات کے جاننے میں کی ہے، جن سے سائنس کی ایجاد و اختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے، جس کو قران نے ''انفس'' کہا ہے، ان ''انفس'' کے اوصاف اور خصائص کا ابھی بہت کم علم ہوا ہے، ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور ابھی طلسم و قریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹیفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

یہی دنیا جو انسان کے اندر ہے خودی کی دنیا ہے انسان کی فطرت ہے کہ جو خیال اس کے دل میں آتا ہے وہ ان ہی واقعات و روایات اور خیالات سے ماخوذ ہوتا ہے جو اس کے گرد و پیش پھیلے ہوئے ہیں، چونکہ یہ دنیا ہماری مادی دنیا سے بالکل مختلف چیز ہے، اس لئے اس کا صحیح طور سے سمجھنا اور سمجھانا محال ہے۔

انسان کے جسم میں سیکڑوں اعضا و جوارح و اعصاب ہیں، یہ اعضا اور جوارح الگ الگ ہیں اور ہر ایک کا کام جدا ہے، لیکن کوئی عضو اس وقت تک کام نہیں دے سکتا جب تک اور تمام اعضا بالذات یا

بواسطہ اس کے عمل میں شریک نہوں، یا کم از کم یہ اس کے کام میں خلل انداز نہوں اسی سے اس بات پر استدلال کیا جاتا ہے کہ ان اعضا کے قوی کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ انسان میں کوئی اور عام قوت ہے جو ان تمام اعضا کی جداگانہ قوتوں سے بالاتر ہے اور جس کی ماتحتی میں یہ سب بالاتفاق کام کرتے ہیں۔ اسی قوت کا نام مذہب کی زبان میں ''نفس'' اور اقبال کی زبان میں ''خودی'' ہے۔

صوفیائے کرام نے اسی حقیقت کا دوسری طرح اظہار کیا ہے، ان کے نزدیک انسان میں دو قسم کے نفس ہیں ادنےٰ نفس اور اعلےٰ، ادنےٰ نفس کو تصوف کی زبان میں انانیت شخصی مجموعہ ہے ہمارے مادی جسم اور حواس خمسہ کا اور انانیتِ حقیقی تغیر و تبدل جیسے نیاز ایک حقیقت ابدی کا نام ہے۔ جو انسان کے جسم میں ہے اور جو لامتناہی ممکنات کی امین ہے۔

اقبال کی خودی کی تعلیم دراصل اسی نفس، اسی حقیقت، اسی اندرونی قوت کے ادراک تفہم و آگہی کی تعلیم ہے، کیونکہ بغیر سمجھے اور جانے کسی قسم کی کوئی مستقل ترقی ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے اقبال نے اپنی تصنیفات میں بار بار اسی مسئلہ پر زور دیا ہے۔

سطور بالا سے کم از کم یہ امر صاف ہو گیا کہ ہستی کا احساس اور اپنے نفس کی حقیقت سے آگاہی کا نام خودی ہے عربی مقولہ ہے کہ مَاہَلک اِمرءٌ عَرَفَ قَدرَہ یعنی جس شخص نے اپنی قدر و منزلت کو (کما حقہ) جان لیا وہ کبھی ہلاک و برباد نہ ہوگا۔'' انسان میں حقائق و معارف اور عروج و سعود کے بہت سے کمالات مضمر ہیں، وہ اپنی ہستی سے جس قدر زیادہ واقف ہوگا اور اُسے اپنی محض قوتوں کا جس قدر زیادہ احساس ہوگا اسی قدر وہ ان پوشیدہ کمالات کو بروئے کار لا سکے گا، اور اپنی زندگی کو زیادہ پختہ و استوار بنا سکے گا یہ ہی اقبال کی تعلیمات کی روح ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی طبیعت میں بہت سے قدرتی جذبات ودیعت ہوئے ہیں، اگر ان قدرتی جذبات کی تربیت اچھی طرح سے ہو تو یہی چیز انسان کی زندگی کو معراج کمال تک پہونچا سکتی ہیں اور اگر یہ جذبات غلط راستہ میں پڑ جائیں تو انسان کو شیطان بنا دیں مثلاً اگر غصہ کو ٹھیک راستہ پر لگایا جائے تو خودداری اور بہادری میں تبدیل ہو سکتا ہے، ورنہ وہ آدمی کو چڑچڑے مزاج کا بنا دیتا ہے۔ نفرت

کا جذبہ کہیں تو حسد بن جاتا ہے اور کہیں رشک، شجاعت کسی کو فاروقؓ خالدؓ سکندر و نپولین بناتی ہے تو کسی کو سلطانہ و بہرام ڈاکو ڈر کسی کو ولی اللہ بنا دیا ہے اور کسی کو مرتد، شوق و جستجو کسی کو سقراط و لقمان بنا دیتا ہے اور کسی کو نکتہ چیں عیب جو جو ہمیشہ دوسروں کی بُرائیاں تلاش کرنے میں، اپنی قوت صرف کرتا ہے، اگر کوئی شخص اس وقت کو اچھی طرح سمجھ لے جو قدرت نے اس کے اندر ودیعت کی ہے تو وہ اس سے بہت کام لے سکتا ہے اور بہت ترقی کر سکتا ہے۔

جماعت افراد کے اور قوم جماعتوں کے مجموعہ کا نام ہے جس طرح ایک فرد اپنی مخفی قوتوں کو سمجھ کر ان کو بروئے کار لا سکتا ہے اور ان کی مدد سے عظیم الشان کام انجام دے کر ترقی کی بام بلند پر پہونچ سکتا ہے، اسی طرح قوم بھی اس قوت کی آگہی و مدد سے دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے، حدیث شریف میں خودی کی اسی قوت کی طرف اشارہ ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفسَهٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّهٗ "یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔" یہی وجہ ہے کہ اقبال نے حقیقت شناسی آگہی نفس اور خودی پر بے حد زور دیا ہے، اقبال کا انسان کو سب سے زبردست پیغام یہی ہے کہ تو اپنے آپ سے واقف ہو جا"۔

اب اسی حقیقت کو اقبالؔ کی زبان سے سنئے، بانگِ درا میں کہتا ہے۔

خودی میں ڈوب جانا غافل کہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شامِ سحر سے بے کراں ہو جا

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

کرمک تاداں طواف شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

.....

بالِ جبریل میں کہتا ہے:۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیدارئ کائنات
خودی جلوہ بد مست و خلوت پسند
سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

.....

حدیثِ دل کسی درویش بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ
غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ
تیری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی
خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ
بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی میں ہے خدائی

خودی کے زور سے دنیا پہ چھاجا
مقام رنگ و بو کا راز پا جا

.....

ضربِ کلیم میں کہا ہے۔

تری خودی سے ہے روشن تراحریمِ وجود
حیات کیا ہے اسی کا سرور و ثبات
بلند ترمہ و پرویں سے ہے مقام اس کا
اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات وصفات
محرمِ خودی سے جس دم ہوا فقر
تو بھی شہنشاہ ، میں بھی شہنشاہ
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

اسرارخودی میں کہا ہے ۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی زِ اسرار خودی است
نقطہ ٔ نورے کہ نامِ او خودی است
زیر ِ خاکِ ماشرارِ زندگانی است

جاوید نامہ میں کہتا ہے:۔

اے خدا بیں خوشتن راہم نگر
بحر رادر قطرۂ شبنم نگر
ہم زخدا خودی طلب ہم زخودی خدا طلب

زبورِ عجم میں بھی یہ ہی نغمہ ہے:۔

منزل گہ من از من بروں نیست
من بے نصیم راہے نہ یا بم

سرراس مسعود کی وفات پر اقبال نے جو مرثیہ لکھا تھا اور جو رسالہ اردو دکن مسعود نمبر بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا' اس میں خودی پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ حیات

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکراں تیرا
ترے فراق میں مضطر ہے موج میل فطرت

خودی ہے مردہ تو مانند کاہ پیش نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطان جملہ موجودات

اس ضمن میں بے محل نہوگا اگر اقبال فلسفہ کے اس اجمالی خاکہ پر بھی نظر ڈال لیں جو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمائش پر لکھا تھا' اس میں علامہ ممدوح فرماتے ہیں۔

"ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے' حیات تمام و کمال انفرادی ہے' حیات کلّی کا خارج میں کہیں وجود نہیں خود خدا بھی ایک فرد ہے۔ وہ فرد یکتا ہے' کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے' لیکن یہ ضرور ہے کہ اس مجموعہ میں نظم و نسق اور توافق و تطابق پایا جاتا ہے' وہ بذاتہ کامل نہیں ہے بہر کیف جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلّی کوششوں کا نتیجہ ہے' ہمارا قدم بالتدریج بد نظمی سے نظم و نسق کی طرف اُٹھ رہا ہے اس مجموعہ کے افراد کی تعداد بھی معین نہیں ہے' بلکہ روز مرہ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے' اور نوزائیدہ افراد اس عظیم الشان مقصد کی تکمیل میں ہمارے معاون ہوتے رہتے

ہیں، یعنی کائنات فعل مختتم نہیں ہے بلکہ ہنوز مراتب تکمیل طے کر رہی ہے.......''

غرضیکہ علامہ اقبالؔ کے الفاظ بالا سے ظاہر ہے کہ انسان کا اخلاقی و مذہبی نصب العین یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹادے یا اپنی خودی کو فنا کردے بلکہ اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے۔ اوراس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش یکتائی پیدا کرے' آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔ ''تَخلَقُو بَا اَخلَاقِ اللّٰہ ''یعنی اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو' پس انسان جس قدر اور جس حد تک اس فرد یکتا سے (خدا کے) مشابہ ہوگا' اسی قدر خود بھی یکتا ہو جائے گا' ذیل کے شعر میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے' ۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آورا ے ہمتِ مردانہ

ترقی کے اصول اور خودی' خودی کے خصوصیات ولوازم بیان کرنے سے پہلے ہمیں دو ایک اور باتوں پر نظر ڈالنا ضروری ہے' زندگی اقبالؔ کے نزدیک عمل وارتقا کا نام ہے اور تربیتِ خودی ترقیٔ حیات کا موثر ترین ذائقہ' ہمیں دیکھنا ہے کہ اقبال نے خودی کے ضمن میں کہاں تک اس امر کو پیش نظر رکھا ہے۔

(۱)۔ انسان کی ترقی کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ وہ خیال کرے وہ اعلیٰ ترین مخلوقات ہے اور تمام کائنات میں جو کچھ ہے وہ اسی لئے ہے کہ انسان اس سے تمتع اُٹھائے' قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:۔

لَقَد خَلَقنَا الاِنسَانَ فِی اَحسَنِ تَقوِیمُ و سَخَرَ لکم ما فی السمٰواتِ وَمَا فِی الارَضِ جَمیعًا ط

ہم نے انسان کو سب سے بہتر انداز میں پیدا کیا۔ تمام آسمان وزمین کی چیزوں کو تمہارا مسخر کیا۔

اقبال کہتا ہے:۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کے سازِ فطرت میں نوا کوئی
(بانگِ درا)

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے
(بالِ جبریل)

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

(۲)۔انسان کی ترقی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کو یقین ہو کہ اس کو خیر و شر ترقی و تنزل، عروج و زوال کا مدار تمامتر اس کی سعی اور کوشش پر ہے امور دنیا اور دین کی تمام کامیابیاں محض اس کی کوششوں پہ موقوف ہے، قرآن کریم میں ہے۔

لَیسَ لِا انسَانِ اِلّا ماسعی ۔انسان کے لئے اتنا ہی ہے جتنی اس کی کوشش ہے۔

اقبالؔ نے ذیل کے شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہی عمل مظہر خودی ہے:۔

(۳)۔کسی قوم کی ترقی کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ اس کے ہر فرد کو من حیث القوم اپنی عزت کا خیال دلایا جائے یہی نکتہ تھا، جس کی وجہ سے اسلام نے ابتدا ہی سے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا۔

کُنتُم خَیرُ اُمَّۃٍ (تم تمام قوموں سے بڑھ کر ہو) اقبالؔ نے ذیل کے اشعار میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔اسرار خودی میں کہتا ہے۔

اے زآداب امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر

بانگِ درا میں کہا ہے۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

بالِ جبریل میں کہا ہے:۔

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر
توری حضوری ترے سپاہی
کچھ قدر تو نے اپنی نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی
یا راہبی کر یا بادشاہی
اک تو کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمیائی

ضربِ کلیم میں کہا ہے:۔

افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگر نہ
اے بندۂ مومن تو بشیری و نذیری
در معرکۂ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی

(۴)۔ترقی کا ایک بہت بڑا اصول یہ ہے کہ افراد یا قوم کو اس کی قوت' اہلیت و امکانات کا یقین دلایا جائے اس سے جذبہ عمل کو حرکت ہوتی ہے' جس کا نتیجہ ترقی ہے۔

اقبالؔ کا پیغام ہے:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

بالِ جبریل میں خودی کی قوت وممکنات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید اسماں اس کا صید

ضربِ کلیم میں کہا ہے:۔

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سبحانی

سرراس مسعود کے مرثیہ میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

❁❁❁

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

دَورِ حاضر کا فِکری بُحران اور اقبالؔ

علامہ اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دُنیا کے مسلمانوں کو عموماً اور برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کو خصوصاً ایک ایسے زمانہ میں حوصلہ مندی ورجائیت کا پیغام دیا جب کہ وہ سخت مایوسی و پریشانی اور شکست وزبوں حالی میں مبتلا تھے اور اس طرح انہوں نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ یہ بات سچ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہئیے کہ علامہ کا پیغام اور ان کے افکار صرف ان کے اپنے دَور کے لئے تھے۔ اور اب جب کہ زمانہ بدل گیا ہے حالات تبدیل ہو گئے ہیں اور تاریکی کے بادل بڑی حد تک چھٹ گئے ہیں ان کے افکار اور تعلیمات ہمارے کسی کام کے نہیں، برعکس اس کے حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے جن نکات کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی ہے وہ بیشتر بنیادی نوعیت کے ہیں اور انسان کی ذہنی و جذباتی فکری و عملی و انفرادی و اجتماعی زندگی کے ایسے پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں جو بھی داستانِ پاستان یا اوراقِ پارینہ نہیں بن سکتے۔ بلکہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں علاّمہ کے افکار اور تعلیمات کی اہمیت، معنویت، اور ضرورت اور بھی نمایاں ہوتی جاتی ہے وہ نہ صرف ایک شاعر کی حیثیت سے بلکہ ایک دیدہ ور مفکر کی حیثیت سے بھی نہایت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے دَور کے فکری و عملی مسائل پر توجہ دی اور خاص طور پر مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ترقی کی راہوں کی نشاندہی کی بلکہ آئندہ پیش آنے والے مسائل پر بھی سوچا اور عام انسانی زندگی اور انسانی دلچسپی کے موضوعات پر بھی غور وفکر اور طبع آزمائی کی انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات نظم میں بھی ادا کئے اور نثر میں بھی اردو اور فارسی میں بھی پیش کئے اور انگریزی میں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اور ہر ذہنی سطح کے قارئین تک اپنی بات پہنچا سکیں۔ ایسی جامع کمالات اور دل و دماغ اور قلم کی ہمہ گیر صلاحیتوں کی حامل شخصیت نہ صرف ہمارے لئے بلکہ سارے عالمِ انسانیت کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں۔

آیئے آج یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے دَور کے اہم ترین مسئلے کے بارے میں علامہ اقبال ہماری کیا

رہنمائی کرتے ہیں۔ یوں تو عصرِ حاضر اپنے ساتھ بے شمار سیاسی واقتصادی، معاشرتی و تعلیمی اور تہذیبی و ثقافتی مسائل لے کر آیا ہے لیکن میری ناچیز رائے میں آج کے انسان کا اور خصوصاً ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا سب سے بڑا مسئلہ فکری بحران کا مسئلہ ہے، ہماری نئی نسلیں جدید علوم وفنون اور نئے افکار و تصورات کے زیر اثر پروان چڑھی ہیں۔ وہ اپنے قدیم روحانی و مذہبی اقدار وافکار کی وراثت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ اور اسی لئے ان مغربی مفکرین و مصنفین کی حلقہ بگوش ہوگئی ہیں جو جدلیاتی مادیت وجودیت منطقی اثباتیت، نتیجیت اور ایسے ہی دوسرے فلسفیانہ افکار کے نقیب ہیں اور مستقل و مطلق قدروں اور بدیہی اصولوں کو نہیں مانتے چنانچہ ہماری یہ نئی پود تمام قدیم اقدار کے بارے میں تشکک میں مبتلا ہو کر یقین واز عان کی دولت سے عاری ہوگئی ہے۔ اسے وہ سہارے میسّر نہیں ہیں جو پہلے کی نسلوں کو باطنی وروحانی عقاید واقدار اور مسلمہ اخلاقی قوانین وضوابط کی شکل میں حاصل تھے۔ آج کے نوجوان خود اپنے حواس وادراک اور ذاتی تجربے اور مشاہدے کو تمام قدیم انسانی، سماجی اور مذہبی اخلاقی اور روحانی قدروں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور عقاید کو اوہام سے تعبیر کرتے ہیں وہ اقلیتی طرز فکر اور تجرباتی سائنس سے اس قدر مرعوب ہیں کہ دینی و مذہبی معتقدات اور روحانی واردات کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے لئے نہ تو عقلی دلائل فراہم کئے جاسکتے ہیں اور نہ انہیں تجربہ خانے میں جانچا جاسکتا ہے۔ عقاید کے اس بحران کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عصر حاضر کا انسان تشکک، تذبذب، بے یقینی اور قنوطیت و میں مبتلا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ انسانی زندگی کی غایت کیا ہے، انسانی اعمال کا کیا مقصد ہونا چاہئیے اور کیوں؟ اخلاق کا کیا معیار ہونا چاہئیے اور کیوں فرد اپنے مفادات کا اور لذّات کا دوسروں کی خاطر خون کرے تو کیوں کرے؟ ان سوالوں کا کوئی تسلّی بخش جواب اس کے ذہن میں واضح نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کے اعمال وافعال میں واضح مقصدیت اور یک جہتی نظر نہیں آتی۔ ہمارے اسلاف جن مابعد الطبیعی مفروضوں پر اپنے معیار اور زاویہ نظر اور طرز عمل کی بنیاد رکھتے تھے ان کا تعین روحانی زندگی اور باطنی قلبی واردات کے حوالے سے ہوتا تھا نہ کہ خارجی و مادی دنیا کے حوالے سے۔ اب عقلیت، تجربیت، عملیت، مادیت، افادیت اور دنیوی و مادی زندگی کو بنیادی قدروں

کی حیثیت حاصل ہوتی جارہی ہے' حیاتِ عاقبت کا تصور دھندلاتا جارہا ہے اور اس گوشت پوست کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ لینے کا رجحان پیدا ہورہا ہے۔ قدیم عقاید متزلزل ہوچکے ہیں لیکن ان کی جگہ لینے والے نئے معتقدات کی تلاش میں آج کا انسان ابھی تک بھٹک رہا ہے' کبھی اس فلسفیانہ نظام کی طرف رجوع کرتا ہے کبھی اس فلسفیانہ نظام کی طرف لیکن اس کی تسلّی نہیں ہوتی' یہی سبب ہے اس کی بے یقینی وتذبذب' تشکک وانتشار' نارسائی ونآسودگی مایوسی وکرب اور شدید احساسِ تنہائی وبے بسی کا' اور ظاہر ہے کہ جس فعل' جس عمل' جس بات کی صداقت وصحت اور غایت کا انسان کو پورا پورا یقین نہ ہو وہ اس کی طرف اپنے تمام خلوص اور صلاحیتوں کے ساتھ متوجہ نہیں ہوسکتا۔ یہی سبب ہے زندگی کے تمام معاملات میں دورِ حاضر کے انسان کے نیم دلانہ رویے کا۔

جس ذہنی کیفیت میں آج کا انسان مبتلا ہے اور شدّت سے مبتلا ہے علامہ اقبال کی دوربین نگاہوں سے وہ پوشیدہ نہ تھی کیونکہ اس کیفیت کی شروعات خود ان کے زمانے میں ہوچکی تھی اور وہ جانتے تھے کہ اس ابتداء کی انتہا کیا ہوگی انہیں عقلیت وتجربیت پسند ذہن کے تشکک وبے یقینی کا خوب اندازہ تھا' چنانچہ انہوں نے اس کا ازالہ کرنے کے لئے عقلیتی وفلسفیانہ طرز استدلال ہی کا سہارا لے کر اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید کے موضوع پر بصیرت افروز خطبات دیئے۔ ان خطبات میں علامہ نے عقل وخرد اور طبیعی محسوسات ومشاہدات پر مبنی علم وحکمت کی اہمیت تو تسلیم کی اور تسخیر فطرت کے لئے سائنسی اور عقلی علوم حاصل کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح واضح کردیا کہ مابعد الطبیعی امور میں عقل بالکل عاجز ہے خدا' روح' آخرت اور حیات بعد الموت جیسے مسائل پر عقل کسی قسم کا فیصلہ دینے سے قاصر ہے ان امور کو نہ تو عقلی دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ مسترد' جرمن فلسفی کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کردیا ہے کہ محض عقلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مابعد الطبیعات ممکن ہی نہیں ہے۔ لہذا عقلیی طرزِ فکر کو استعمال کر کے مذہبی عقاید اور دینی تصورات کو ردّ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان کا تعلق طبیعی دنیا سے نہیں بلکہ مابعد الطبیعات سے ہے۔

مختلف شواہد اور دلائل پیش کر کے علامہ ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کے حواس خمسہ اور عقل ہی واحد

ذریعۂ علم نہیں بلکہ وجدان اور الہام بھی نہایت اہم ذریعہ علم ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں اپنی ذات یا خودی کا علم حواسِ خمسہ سے نہیں بلکہ وجدانی طور پر ہوتا ہے جہاں تک وحی والہام کا تعلق ہے جن انبیاء کو یہ نعمت عطا ہوئی تھی ان کی زندگیاں ۔ ان کی سیرتیں اور جس انداز میں انہوں نے اپنی قوموں یا معاشروں کو متاثر کیا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ نہ تو دروغ گو تھے نہ نفسیاتی واعصابی مریض جو فریب خیال کی بیماری میں مبتلا تھے۔ واہمے میں مبتلا نفسیاتی مریض انسانیت کی تقدیر نہیں بدل سکتے تھے جس طرح کہ وحی والہام کے حامل انبیاء نے بدلی۔ عقلیت پرستوں اور تجربی سائنس دانوں کو حواس وعقل سے عالم محسوس کے بارے میں جو تجرباتی علم حاصل ہوتا ہے ویسا ہی یقینی اور تجرباتی علم انبیاء کو اپنے باطنی واردات ومشاہدات کے ذریعے ہوتا ہے۔ ان کی وحی والہام کو ہم محض اس بناء پر مسترد کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے کہ ہمیں ویسے مشاہدات وواردات کا تجربہ نہیں ہوا۔ چنانچہ علامہ نہایت مدلل' و معقول انداز میں وحی والہام سے حاصل شدہ ہدایت ومعرفت کی اہمیت کو ثابت کرتے ہیں اور اس طرح توحید' رسالت' آخرت اور بقائے روح جیسے دینی عقاید کے لئے ایک مضبوط اساس مہیا کرتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ الہامی مذاہب صرف عقاید ونظریات کے ضابطے ہی نہیں بلکہ اقدار کے اصول مطلق کو گرفت میں لینے کی ایک مہم ہے اور وہ ہم میں فوق الحواس اور وراء الوراء حقیقتِ مطلقہ کا شعور بھی بیدار کرتے ہیں۔ علامہ اپنے آخری خطبے میں یہ کہتے ہیں کہ ''جس مایوسی اور دل گرفتگی میں آج کی دنیا گرفتار ہے اور جس کے زیر اثر انسانی تہذیب کو ایک زبردست خطرہ لاحق ہے اس کا علاج نہ تو عہد وسطیٰ کی صوفیانہ تحریک سے ہوسکتا ہے اور نہ جدید زمانے کی وطنی قومیت اور لادینی اشتراکیت کی تحریکوں سے' اس وقت دنیا کو حیات نو کی ضرورت ہے اگر عصر حاضر کا انسان دوبارہ وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھا سکے گا جو جدید سائنس نے اس پر ڈال رکھی ہے تو صرف مذہب کی بدولت' صرف اسی طرح اس کے اندر ایمان اور یقین کی اس کیفیت کا احیا ہوگا جس کی بدولت وہ اس زندگی میں ایک انفرادیت پیدا کرتے ہوئے آگے چل کر بھی اسے محفوظ اور برقرار رکھ سکے گا۔

غرض علامہ اقبال اپنے خطوط میں آج کی عقلیت پرست اور سائنس زدہ انسان پر یہ بخوبی واضح

کردیتے ہیں کہ وحی والہام سے حاصل شدہ ہدایت ومعرفت اس انسانی علم کی تکمیل کے لئے ضروری ہے جو حواس اور عقل کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ایک شعر میں اس نکتے کو یوں بیان کیا ہے۔

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

اپنے ایک مکتوب میں علامہ کہتے ہیں ''علم سے میری مُراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال لیا ہے اس علم سے ایک طبیعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہئیے ۔اگر یہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے' مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔ بولہب را حیدرِ کرار کن اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کیئے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسانی کے لئے سراسر رحمت ہے۔

چنانچہ علامہ ہمیں سمجھاتے ہیں کہ حواس وعقل سے حاصل شدہ علم اگر وحی والہام سے حاصل شدہ ہدایت ومعرفت سے لاتعلق یا متصادم ہو تو وہ مشکوک ہے اور ایسا علم ہمیں سوائے ناکامی ومایوسی' شکست ومحرومی کے اور کسی منزل پر نہیں پہنچائے گا۔جدید انسان کا المیہ یہی ہے کہ اس نے اپنے طبیعی وتجربی علوم ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے اور محض اُنہی کی روشنی میں زندگی' کائنات' زمانہ' تہذیب اور معاشرے کی حقیقت وماہیت اور غایت ومنصب کو پانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اس کوشش میں ناکامی کی وجہ سے قنوطیت اور تذبذب وبے یقینی میں مبتلا ہو کر جھنجھلا اُٹھتا ہے اور زندگی ہی کو لایعنی قرار دے دیتا ہے۔

علامہ اقبال نے یقین وایمان سے پیدا ہونے والی دلی کیفیت کو عشق کا نام دیا ہے اور کبھی اسے شوق کے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔کبھی سودا' کبھی جنوں' کبھی مشتاقی' کبھی جذب قلندرانہ' کبھی نظر اور کبھی دید کے لفظ سے وہ بالاصرار یہ بتاتے رہتے ہیں کہ زندگی میں کامیابی اور ترقی وآسودگی کے لئے عقل اور عشق کا امتزاج بے حد ضروری ہے۔کامل انسان کو وہ ''نہایت اندیشہ وکمال جنوں'' کا آمیزہ قرار دیتے ہیں۔عقل اور عشق کا موازنہ ان کا محبوب موضوع ہے اور یہ اس لئے کہ دورِ حاضر میں عقلیت کو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے اور دَورِ حاضر کا انسان عقلیتی طرز فکر کو مابعد الطبیعی دُنیا تک پھیلا کر ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا۔علامہ اسی لئے اپنی شاعری میں مذہب عقل کے مقابلے میں مذہبِ

عشق کے اس قدر پر جوش مبلغ بن جاتے ہیں کہ بعض لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ اقبال کو عقل سے بیر ہے۔ حقیقت صرف یہ ہے علامہ اقبال کا مقصد عقل کے احاطہ کار کو قطعیت کے ساتھ متعین کر کے اس کی محدودیت کی طرف توجہ دلانا ہے تا کہ عقلی علم' حجاب اکبر نہ بن جائے' جب وہ کہتے ہیں کہ ۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں

اس کی تقدیر میں حضور نہیں

تو اس سے عقل وفکر یا حواسی علم کی تنقیص یا اس کا یکسر استرداد مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اس کے اسکوپ یعنی حدِ وسع کی تعیین مقصود ہے۔ علامہ اقبال تو عقل وعشق دونوں کے امتزاج کے قائل ہیں اور زمانہِ جدید کے انسان کی فِکری الجھنوں کا حل اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ مابعد الطبیعی امور پر عقل کی ورزش کرنے کے بیہودہ عمل کے بجائے توحید ورسالت' آخرت وبقائے روح جیسے عقاید پر ایمان لے آئے کہ ان باتوں کا یقینی علم ہمیں ان بزرگ ہستیوں نے دیا ہے جو اپنے کردار وسیرت کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ جنہوں نے تاریخ کے رُخ کو پھیرا ہے' کروڑوں انسانوں کو حیاتِ نو بخشی ہے اور اپنے معاشروں میں اور اس سے ماورا زمان ومکان کی مطلقیت ولامتناہیت کے تصور کو زائل کر دیا ہے۔ یہ سمجھنا کہ مادہ ہی اصل حقیقت ہے اور عقل وحواس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم موجود نہیں ہے یا تو نادانی ہے یا ہٹ دھرمی' جب تک آج کا انسان اس نادانی یا ہٹ دھرمی پر ڈٹا رہے گا بے یقینی' نا آسودگی' کرب اور احساس تنہائی وبے بسی میں مبتلا رہے گا۔ بقول اقبالؔ۔

ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

❁❁❁

غلام جیلانی برقؔ

فکرِ اقبالؔ کے چند پہلو

اقبال ملّی اسٹیج پر ایک ایسے وقت نُمودار ہوا' جب مسلمانوں کا جلال افسانہ ماضی بن چکا تھا۔ یہ اخلاقاً رسوائے عالم۔ ذہناً افسردہ' مایوس اور معاشی لحاظ سے بے نوا و مفلس ہو چکے تھے' اقبال نے ساز اٹھایا' تاروں کو چھیڑا اور ایسے گیت الاپنے لگا جن میں شوخیٔ ناز بھی تھی اور حرارتِ نیاز بھی۔ عروق مردہ میں زندگی کا لہو دوڑنے لگا اور ؎

افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

اقبال کا پیام صد جہات ہے کہیں وہ جذبات انسانی کی ترجمانی کرتا ہے کہیں مجاز و حقیقت میں فرق بتاتا ہے۔ کہیں چیستان تقدیر کو حل کرتا ہے' کہیں عقل و عشق کی حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے' کہیں خودی و بے خودی کے اسرار سمجھاتا ہے۔ اور کہیں عقاب و ضیغم بننے کا درس دیتا ہے۔ ایسے ہمہ گیر اور وسیع پیغام کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنے کے لئے ایک طویل فرصت درکار ہے جو مجھے میسر نہیں اس لئے میں یہاں چند معروضات پر اکتفا کروں گا۔

موت و حیات:۔

اقبال کے ہاں ؎ فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں

چونکہ ملی مقاصد کے امکانات لامحدود ہیں۔ اور زندگی محدود۔ جہاں لامحدود آرزوؤں کی تکمیل نا ممکن ہے اس لئے باہمت لوگ اس جولان گاہ کی تلاش میں رہتے ہیں جو موت فراہم کرتی ہے۔ یہ لوگ موت کا شکار نہیں بلکہ اس کے شکاری ہیں ؎

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید
مرگ است صیدے تُو در کمینی

جانے کہ بخشند دیگر نگیر ند
آدم بمیرد از بے یقینی

اقبال کے ہاں انسان جسمانی نہیں بلکہ ایک روحانی حقیقت ہے۔رُوح ایک آنکھ ہے۔جس سے فانی غیر فانی کو دیکھ سکتا ہے۔موت کے بعد جسم مٹی میں مل جاتا ہے۔اور روح اپنے مرکز کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔

اللہ کی طرح روح بھی لازماں۔غیر منقسم

غیر مشخص اور بے کیف وکم ہے۔رُوح وکائنات میں آقائی و بندگی کا رشتہ ہے جولوگ بُت کدۂ وجود میں مظاہر کے پجاری بن جاتے ہیں ان کی رُوح پر موت طاری ہوجاتی ہے۔روح کی توانائی آقائی میں ہے۔نہ کہ بندگیٔ مظاہر میں۔زمیں' پراترنے سے پہلے انسان فرشتوں کی ادائیں دیکھنے میں محوتھا' اوراب تسخیر مظاہر کے بعد آئینہ ایام میں اپنی ادائیں دیکھ رہا ہے۔

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں — تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں اب اپنی ادا دیکھ

روح کا سب سے بڑا جوہر اور زندگی کی سب سے بڑی توانائی عشق ہے۔عشق کا خلاصہ جذب و مستی' ذوق وشوق اور تلاش واضطراب ہے' عشق زندگی کا سب سے بڑا مُحرّک ہے۔اسی سے کائنات مُسخّر ہوتی ہے۔یہی وہ دام ہے جس کے سامنے جبرئیل صید زبوں بننے پر مجبور ہوجاتا ہے۔اسی سے ذاتِ یزداں پر کمند ڈالنے کے منصوبے سوچے جاتے ہیں جب عشق بجلی تُندی کے ساتھ منازلِ مجاز سے گزرتا ہے تو عقل مرعُوب ہوکر اپنے گلے میں طوقِ غلامی ڈال لیتی ہے اقبالؔ اس عالمِ رنگ وبُو پر ترس کھاجاتا ہے۔اور کہتا ہے۔کہ تیرا اور میرا ساتھ عارضی ہے۔اس لئے کہ تیرا دوام موت میں ہے اور میرا دوام عشق میں۔

من بندۂ آزادم، عِشق است امامِ مَن عِشق است امامِ مَن، عقل است غلامِ من
ہنگامۂ ایں محفل از گردشِ جامِ من ایں کوکبِ شام سن، ایں ماہِ تمامِ من
اے عالمِ رنگ و بُو! ایں صحبتِ ماتا چند
مرگ است دوام تو، عِشق است دوامِ من

(میں بندہ آزاد ہوں، عشق میرا امام ہے، عقل میری غلام ہے، محفلِ امکان کا ہنگامہ میرے جام کی گردش سے قائم ہے یہ جام میری شام کا انجم، میری رات کا چاند ہے، اے عالمِ رنگ وبُو، ہمارا ساتھ کب تک رہے گا، تیرا دوام موت میں ہے اور میرا دوام عشق میں ہے)

برکلے نے کہا تھا کہ ''زندگی موہوم ہے یہ مشہودات فریب نظر ہیں اور مدرکاتِ فریبِ شعور''

غالبؔ نے کہا تھا کہ یہ زندگی ایک خواب ہے اور موت پیام بیداری، ہر دور میں ایسے فلسفی پیدا ہوتے رہے جنہوں نے وجود پر شبہات کے حجاب ڈالنا چاہے لیکن عِشق نے زندگی میں بلآخر اس قدر وسعت، بالیدگی اور چمک پیدا کردی کہ تمام شُبہات کافور ہوگئے اور زندگی ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آگئی:۔

در بُود و بنودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

(میرے ہونے اور نہ ہونے کے متعلق عقل گرفتارِ گماں تھی لیکن عِشق نے اس حقیقت کو واضح کردیا کہ میں موجود ہوں۔)

دل کی دُنیا:۔

ارباب فکر کہتے ہیں کہ دماغ کی زینت علم ہے اور دل کی آرائش مختلف فضائل، مثلاً رحم، مروت، انکسار انصاف وغیرہ جن میں محبت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اگر دل محبت سے خالی ہو تو اس میں کوئی پاکیزہ جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ رحم، احسان اور انصاف وہی کرسکتا ہے جسے دنیائے انسانی سے محبت ہو دل تمام توانائیوں کا سرچشمہ ہے۔ محبت یہیں جنم لیتی ہے فقر و استغناء کے سوتے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔ سوز و ساز کی حسین کیفیات کا مرکز یہی ہے اور حقیقت کی کرنیں اسی روزن سے داخل ہوکر روح کو

منوّر کرتی ہیں، علم بے شک ایک عظیم طاقت ہے لیکن اس کے ساتھ محبت بھرا دل نہ ہو تو یہ نوعِ انسان کے لئے لعنت بن جاتا ہے۔ آج دنیا کی بعض اقوام کے پاس علم تو ہے، لیکن وہ دل موجود نہیں جو محبت سے چھلک رہا ہو، نتیجۃً ان کا علم کائنات کے لئے مصیبت بنا ہوا ہے۔

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام　　آں چناں زہرے کہ از روئے مار ہا در پیچ و تاب

انقلاب اے انقلاب

(عصرِ حاضر کے آبگینوں میں مجھے وہ زہر نظر آتا ہے کہ اگر سانپ اسے دیکھ پائیں تو غش کھا جائیں۔ کہاں ہے انقلاب اسے آواز دو)۔

حکیم مشرق کے ہاں دو چیزیں بیکار محض ہیں، ۔اول وہ فقر جس کے ساتھ جلالِ سنجر نہ ہو۔ اور دوم وہ علم جو جمالِ محبت سے معرّا ہو اس لئے دعا کرتے ہیں کہ

فقر بخشی یا شکوہِ خسرو پرویز بخش　　یا عطا فرمایا خرد یا فطرتِ رُوح الامیں

یا چناں کُن یا چنیں

(اے اللہ اگر فقر دے تو شکوہِ پرویز بھی ساتھ عطا کر، اور اگر علم دے تو روح الامینی فطرت بھی عطا ہو یا اُس طرح کر یا اس طرح)۔

علم کو کائنات میں کثرت نظر آتی ہے اور دل کو وحدت۔ دل کی آنکھ کا نام وِجدان ہے ستاروں کی بکھری ہوئی محفل اور کہستاں کے بلند و پست سلسلوں میں اگر کوئی رشتۂ وحدت نظر آتا ہے تو صرف وجدان سے۔ یہ وہ دوربین ہے، جس کی رسائی سے خود خدا بھی باہر نہیں۔ علم مقامِ خبر ہے۔ اور دل مقامِ نظر علم کو مقام دید کی کیا خبر اسے خلوتِ حسن میں کون جانے دیتا ہے۔ زمینی کتابیں عقل پر اتریں اور آسمانی کتابیں دل پر عقل ظن و تخمین ہے اور دل دنیائے یقین۔ دل اُمّ الکتاب ہے اور عقل ابن الکتاب:۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن　　عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندہ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن　　عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام　　شورشِ طوفان حلال لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام　　علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

علم بے شک ایک فردوس ہے لیکن حور سے خالی، ایک پربت ہے لیکن جلوۂ طور سے خالی۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن　　یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
دل بینا تو کر خُدا سے طلب　　آنکھ کا نُور دِل کا نُور نہیں

علم بے شک ایک توانائی ہے اس سے بڑی توانائی عشق ہے۔ جب یہ دونوں طاقتیں شاہراہِ زندگی پہ ہمسفر بن جاتی ہیں تو علم بھی عشق میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد حیرت فارابی و سوزِ رومی کی سرحدیں باہم مل جاتی ہیں۔

عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد　　از تاب و تبِ رومی تا حیرت فارابی

انسانی ذہن کا بلند ترین کارنامہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یعنی اللہ تعالےٰ کا ادراک یا عرفان ہے جو دل کا کام ہے عرفان تمام مسرتوں کا سرچشمہ اور تمام توانائیوں کا مخزن ہے۔ اسی تصور سے زندگی کی شبِ یلدا منور ہوتی اور اسی سے منتشر کائنات میں وحدت نظر آتی ہے۔

وادیٔ کائنات میں یمِ زندگی رواں ہے۔ یہ مختلف مظاہر وہ امواج ہیں جو یم زندگی سے دمادم اٹھ رہی ہیں موج، دریا سے جدا معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت الگ نہیں۔ دریا ایک ہے۔ اور اس کے مظاہر تعداد۔

دَما دَم رواں ہے یمِ زندگی !　　ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود　　کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر　　مگر ہر جگہ بیچگوں بے نظیر

پیامِ اقبال کے بیسیوں اور بھی پہلو ہیں جن کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں اس لئے انہی گزارشات پر اکتفاء کی جاتی ہے۔ ❁❁❁

طاہر عثمانی

پیامِ اقبالؔ۔۔نوجوانوں کے نام

بلاشبہ کسی قوم کا مستقبل اس قوم کے نوجوانوں سے وابستہ ہوتا ہے' یہی وجہ ہے کہ نوجوان قوم کا سرمایہ قرار دیئے گئے ہیں۔ جوان خون کی روانی افکار و خیالات کو جامد ہونے نہیں دیتی بلکہ اس کو آمادۂ عمل ہونے پر اکساتی ہے۔ خون کی گرمی' جسم کی حرکت اور خیالات کی برق رفتاری ان میں انقلاب کو جنم دینے کی حیرت انگیز صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ تاریخِ عالم میں رونما ہونے والے انقلابات کا اگر ہم بہ نظرِ غائر جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ہر وہ انقلاب جو تاریخ میں سنہرے الفاظ سے لکھا گیا ہے اس کے پیچھے نوجوانوں ہی کی طاقت کارفرما رہی ہے۔ اسی لئے داعی انقلاب' شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے نوجوان ہی کو اپنی آرزوؤں و تمناؤں کا مرکز' تصورات کی آماجگاہ اور اپنے پیامِ انقلاب آفریں کا اوّلین مخاطب سمجھا اور ان ہی کو قوم کے باعزت مستقبل کی ضمانت قرار دیا۔

اقبالؔ نوجوانوں کی کردار سازی پر خاص توجہ دیتے ہیں اور ان میں خودی کے احساس کو اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ غیرت و حمیت کے خوابیدہ جذبات کو از سرِ نو جگانے' ایک نئی تڑپ اور ایک نئی خلش سے آشنا کروانا چاہتے ہیں اور یوں وہ قدرت کے اس عظیم الشان راز پر سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ قوموں کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر نوجوانانِ ملت کے کردار' سیرت' جذبہ خودی' احساسِ غیرت و حمیّت کے معیارات پر ہوتا ہے۔

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اور آگے چل کر کہتے ہیں۔

اگر جواں ہوں میری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

''جس قوم کے نوجوان غیرت مند ہوں تو پھر اس قوم کو اس بات کا کوئی غم نہیں کہ وہ تنگدست ہے' امیروں اور دولت مندوں میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔'' اقبالؒ کا یہ کہنا حد درجہ حقیقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ کتنے ہی ایسے بے تاج شہنشاہوں کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے جن کے سامنے شہنشاہوں نے بڑے احترام سے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔ اوران کے در پر حاضری دینے کو باعثِ فخر جانا ہے۔ وہ غیور و شجیع نوجوانوں کے عملی مظاہر بھی تھے۔ جن کے سبب نہ تخت و تاج' نہ قیصر و کسریٰ' نہ دارا کی دارائی' نہ روما کی تعدادِ افواج ڈرا سکی اور نہ ملکوں کی دوری ان کے راستے میں حائل ہو سکی۔ اور نہ ہی ریگستان کی تکالیف انھیں اپنے عزائم سے پیچھے ہٹا سکے۔ اس بارے میں علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ۔

وہی جواں ہے قبیلہ کی آنکھ کا تارہ
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا' غزال ' تاتاری

خدا نے اس کو دیا ہے شکوہِ سلطانی
کہ اِس کے فقر میں ہے حیدری و کراری

گویا اقبالؒ نوجوانوں کے کردار میں شباب کی لغزشوں کے افسانوں کی کوئی جگہ نہیں پاتے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہی ہر ایک کی آنکھ کا تارہ بن سکتا ہے۔ جس کا دامنِ شباب گناہوں کی آلودگیوں سے بے داغ ہے اور جو شباب کے وقفہ کو ایک نصب العین سے وابستہ کر کے اس کے حصول کے لیے جدو جہد کرنے لگتا ہے۔ جنگ ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیر ہے کہ شکار پر جھپٹ رہا ہے اور صلح ہو رہی ہو تو وہ رعنا' غزال اور تاتاری کی مثال بن جاتا ہے۔ اگر کسی قوم میں حضرت علیؓ کی سادگی اور زورِ شجاعت آجائے تو تب اس کے سر حکمرانی کا تاج قدرت کی طرف سے پہنایا جانا یقینی ہے۔ یہی وہ معیار کی کسوٹی ہے۔ جس پر اقبالؒ آج کے نوجوانوں کو پرکھنا چاہتے ہیں لیکن مایوسی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ آج نوجوانوں میں سہل پسندی' تن آسانی اور کشاکشِ حیات سے گریز بڑھ گیا اور عیش و نشاط کی محفلوں کو سجانے میں مشغول ہیں۔

ترے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اور سوچ کر وہ رات رات بھر تنہائیوں میں روا ٹھتے ہیں' اور کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتے ہیں۔

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی !
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی ؟

نوجوان جب کشمکشِ حیات کے نام پر گھبراتا' انقلاب اور تبدیلی کے نام پر لرزتا' گہوارۂ عیش و طرب میں جھولتا نظر آتا ہے تو اقبالؔ چلا اٹھتے ہیں کہ قدرت نے کمالِ فیاضی سے تجھے شاہین کی نظر عطا کی ہے۔ مگر تیری مرعوبیت نے اُسے بھی نگاہ خفاش بنا کر رکھ دیا ہے۔

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے تیرا
زندگی موت ہے' کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہین بخشا
جس میں رکھدی ہے غلامی نے نگاہِ خفّاش

اقبالؔ کے اس پیغام کو ہمارے سامنے آئے بتیس (۳۲) برس ہو چکے۔ مگر یہ کتنی بدبختی کی بات ہے کہ اس وقت کی نوجوان نسل نے جواب بزرگی کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ اس کو سنا تک نہیں۔ اور نہ اس کا اثر آج کے نوجوانوں پر ہوا۔ ان کی حالت میں آج بھی ذرّہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی۔ آج کا نوجوان بھی آرام کا دلدادہ' جدوجہد سے دور' سکون کا متلاشی ہل چل سے مجبور' جمود و سکوت کا شیدائی' پیہم حرکت سے کوسوں دور' تقدیر پر قانع اور دستِ تدبیر سے محروم نظر آتا ہے۔ علامہ اقبالؒ جہاں نوجوانوں سے شکوہ سنج ہیں وہیں ان کو برائیوں اور پستیوں کی طرف ڈھکیلنے میں والدین اور خداوندانِ مکتب کو بھی برابر کا شریکِ جرم قرار دیتے ہیں۔ جو بچوں کو شاہین کے بال و پر عطاء کرنے کے بجائے ممولے کا جگر عطا کر رہے ہیں۔ آج کل ماں باپ کی یہ عین تمنا بن گئی ہے کہ بچے پڑھ لکھ کر سکون و آرام کی زندگی گزاریں۔ قالین کے فرش پر چلیں' مخمل کے صوفوں پر بیٹھیں' سکوت کو حرکت کا نام دیں' غلامی کا طوق گلے میں ڈال لیں اور اسے سندِ آزادی سمجھ کر فخر کریں اور اپنے مقام کو پستیوں میں تلاش کرنے

لگیں۔ حالانکہ شاہین کا نشیمن تو قید و بند کے ان حصاروں میں نہیں ہوتا۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کی گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

یہی وجہ ہے کہ وہ موجودہ زندگی پر قانع رہنے کی تعلیم دینے والے ان خود ساختہ ملّایانِ دین و مذہب، واعظینِ ذی احتشام کی تنگ نظریوں کے خلاف برانگیختہ ہو کر خدا کے حضور شکایت کرتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اتنا کچھ ہونے کے باوجود اقبالؔ مایوسی کو کفر جانتے ہیں اور نا اُمیدی اور یاس و حرماں نصیبی کے سایوں سے دور امید کی جوت جلاتے ہیں۔

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

وہ جانتے ہیں کہ مٹی خشک ضرور ہوگئی ہے لیکن اس میں بیج کو زندہ کرنے، توانا بنانے کے وہ سارے اجزا موجود ہیں۔ شرط صرف پانی پہنچانے، سیراب کرنے کی ہے تو وہ خود اقبال کے پیغام نے پہنچا دیا۔ نیند کے ماتوں کو جگانے کے لئے نقارۂ ذہن پر چوٹ لگا دی۔ اب یہ نوجوانوں کا کام ہے کہ وہ اقبالؔ کو پڑھیں، سمجھیں اور عملی زندگی میں برتنے کی کوشش کریں تا کہ ان کے ضمیر کو ضربِ کلیم جھنجوڑنے لگے۔ اگر وہ اپنے آپ میں خودی کا جذبہ بیدار کرلیں، قدامت پسندی کے بوسیدہ حصاروں کو توڑ کر جدید تقاضوں کی دنیا میں اپنے قدم جمالیں، شاہین کی پرواز، عقاب کی نظر، جوشِ حمیّت اور جذبۂ ملّی سے سرشار ہو جائیں تو عجب نہیں کہ ہماری صدیوں کی غلامی آزادی میں بدل جائے غلامی اور آزادی کے اوزان و پیمانہ جات بدل جائیں۔ عزم اور ارادوں کی کرنوں سے، پگھلتے ہوئے لاوہ سے ایک ایسا قلعہ، ایک ایسی فصیل تعمیر ہو کہ باطل کا کرّ و فر، طوفانِ امواج بن کر ٹکرائے تو پاش پاش ہو جائے۔ آتشِ انتقام کے بھیانک عفریت حملہ آور ہونا چاہیں تو آن کی آن میں راکھ کا ڈھیر بن جائیں۔ تب مایوسی اور نا امیدی کے جو بادل ملّت کے مستقبل پر چھائے ہوئے ہیں دیکھتے ہی دیکھتے آس و امید کی گھٹاؤں میں

تبدیل ہو جائیں گے جو برسیں تو کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔ مسلسل جدو جہد اور پیہم کشمکش ان کا وطیرہ بن جائے تو طوفانوں میں گھرے ہوئے سفینہ کو بھی آسودۂ ساحل ہونا نصیب ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اقبالؒ اذہانِ پارینہ سے کوئی توقع نہیں رکھتے کہ ٹھنڈا خون حرارتِ ایمان سے تو معمور رہتا ہے لیکن حرکت و عمل سے مفلوج ہوتا ہے اور اعضائے جسمانی کی کمزوری انھیں میدانِ جہد سے ہٹا کر گوشہ تنہائی کا دلدادہ بنا دیتی ہے۔

گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

اسی لیے وہ پیرانِ حرم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلہ نم خوردۂ سے ٹوٹے گا شرر کیا

اور آگے چل کر کہتے ہیں کہ

اے پیر حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا

وہ اذہان کہن سے یہ کہہ کر خاموش نہیں رہتے بلکہ خود نوجوانوں سے بڑھ کر کہتے ہیں کہ۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

گویا اقبالؒ نے اسباب کی تلاش کر لی۔ نوجوانوں کو خودی کے ہتھیاروں سے لیس کر دیا۔ صورِ بیداری پھونک کر خدا کے حضور میں دعا کرتے ہیں۔

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

❁❁❁

سید غوث الدین

اقبالؔ، شاعری اور شخصیت کے آئینے میں!

اقبالؔ ایک ایسے فنکار ہیں جن کی شاعری نہ صرف اسلوب کے اعتبار سے اردو ادب میں یادگار رہے گی بلکہ مواد کے اعتبار سے بھی اُسے تمام دنیا کے ادب میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کیونکہ انھوں نے جذبہ واحساس کی لطافت کے ساتھ اعلیٰ تفکر کو اپنایا ہے۔ گویا ان کی شاعری زندگی کے حقائق کی تفسیر ہے۔ صرف تفسیر ہی نہیں بلکہ اس کو سنوارنے، سدھارنے اور آگے بڑھانے کا ذریعہ بھی۔ وہ دنیا کے ان چند عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جن کا دنیائے انسانیت پر احسان ہے اور رہے گا۔

اقبالؔ کی شاعری اور زندگی میں بڑی ہم آہنگی ہے ان کی شاعری کی شوکت اور اس کا طمطراق ان کی زندگی کی سادگی میں نظر آتا ہے۔ وہ بالکل سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ظاہری شان وشوکت کی طرف ان کی توجہ بالکل نہیں تھی اس کے علاوہ وہ بڑے خوددار بھی تھے اور کسی کا ممنون احسان ہونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے بڑے امراء کے وضائف ومناصب قبول نہیں کئے۔ صرف نواب بھوپال کی پنشن قبول کی وہ بھی اپنے دوست سر راس مسعودؔ کے اصرار پر۔

اقبالؔ بڑے بذلہ سنج اور ظریف انسان تھے۔ ان کی گفتگو سے ان کی ذہانت جھلکتی تھی ان کا گھر لاہور میں اہل علم وفضل کا مرکز تھا۔ وہ صرف اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ جو بھی ان کی صحبت میں شریک ہوتا ان کے حُسنِ اخلاق اور ذہانت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

وہ طالب علمی کے دور میں بھی بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے ایک مرتبہ جب وہ مکتب کو دیر سے پہنچے تو معلم صاحب نے پوچھا کہ کیا بات ہے اقبالؔ آج دیر سے آئے؟''۔ تو اقبالؔ نے جواب دیا کہ ''اقبال ہمیشہ دیر سے ہی آتا ہے''۔

ایک مرتبہ کسی بزرگ کے پاس گئے چونکہ لوگ زیادہ تھے اس لئے اقبال کو پائیدان کے پاس جگہ ملی اور وہ وہیں بیٹھ گئے۔ لیکن جب بزرگ نے دیکھا کہ اقبالؔ پائیدان کے پاس ہی بیٹھ گئے ہیں تو

انھوں نے کہا اقبال ادھر آؤ تو اقبال نے جواب میں کہا کہ اقبال تو آپ کے پیروں کے پاس ہی ہے۔

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال کا تعلق ہندوستان کی سرزمین کے خوبصورت خطہ کشمیر کے ایک معزز اور قدیم خاندان سے تھا۔ سرزمین ہند کو اس بات پر فخر حاصل ہے کہ اس نے اقبال جیسے بلند پایہ اور بے نظیر شاعر کو پیدا کیا۔

اقبال ۱۸۷۷ء میں پنجاب کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اقبال بچپن ہی سے بے حد ذہین اور ہوشیار طالب علم رہے۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر میٹرک تک اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اول آتے رہے اسی وجہ سے ان کو حکومت کی جانب سے تعلیمی وظیفے ملتے تھے۔

اقبال نے تین شادیاں کیں پہلی شادی آفتاب اقبال کی والدہ سے جو اسلامیہ کالج میں پروفیسر رہ چکی ہیں۔ دوسری بیوی گجرات کی رہنے والی تھیں انھیں سے دو بچے جاوید اقبال اور منیرہ بانو ہوئے تیسری شادی لدھیانہ کی رہنے والی ایک حسین وجمیل خاتون سے کی لیکن ان کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

شاعر کی حیثیت سے تو وہ مشہور تھے ہی لیکن اب عالم فاضل اور مفکر کی حیثیت سے بھی دنیا انھیں جاننے لگی چنانچہ مدراس میں موصوف کو اسلام پر توسیعی لکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا وہاں انھوں نے جملہ آٹھ لیکچر دیئے جو انگریزی زبان میں چھپ چکے ہیں۔

۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال حیدرآباد پہنچے یہاں ان کا پُر تپاک استقبال کیا گیا وہ ریاست کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائے گئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے ان کے اعزاز میں ایک بزم سخن منعقد کی اور نظام میر عثمان علی خان نے بھی اپنے محل شاہی میں دعوت کی۔

گو اقبال ۱۹۲۶ء میں سیاسیات کے خارزار میں آئے لیکن دو تین ہی سال میں ایسی شہرت و مقبولیت حاصل کی کہ ۱۹۳۰ء میں انہیں ایک سیاسی جماعت ''مسلم لیگ'' نے اپنا صدر مقرر کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ ان کی پہلی تصنیف نثر میں ہے۔ لیکن شاعری میں پہلی کتاب فارسی مثنوی ''اسرار خودی'' کے نام سے ۱۹۱۵ء میں طبع ہوئی۔ اس کے بعد اس کا دوسرا حصہ ''رموزِ بے خودی'' کے نام سے نکلا۔ ۱۹۲۲ء میں ''پیام مشرق'' کے نام سے اقبال نے گوئٹے کے مغربی دیوان کا جواب لکھا۔ اس میں زیادہ تر رباعیاں، غزلیں اور چند طویل نظمیں بھی ہیں۔ اردو نظموں میں یہ دور ادبی اعتبار سے

بڑا زرخیز تھا۔ اکثر معرکۃ الآرا نظمیں جیسے ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''شمع و شاعر''، ''خضرِ راہ'' اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ اور اس کے بعد اقبالؔ نے ۱۹۲۴ء میں اپنی اردو نظموں کا پہلا مجموعہ ''بانگ درا'' کے نام سے شائع کیا۔

''بانگ درا'' اور ''پیامِ مشرق'' کی اشاعت کے بعد ''زبورِ عجم'' شائع ہوئی جس کے چار حصے ہیں۔ غزلوں سے ابتداء ہوئی اسی میں فارسی غزل کی تمام شیرینی اور حلاوت موجود ہے۔ صرف حلاوت ہی نہیں خیالات کی جدت بھی ہے۔

اس کے بعد اقبالؔ نے مشہور شاعر ڈانٹے کی طرز میں اپنا شاہکار ''جاوید نامہ'' ۱۹۲۹ء میں لکھنا شروع کیا یہ ان کے خیالات کا نچوڑ اور فارسی ادب کی بہترین تصنیف ہے اس کے بعد اردو کلام کا دوسرا مجموعہ ''بالِ جبریل'' ۱۹۳۵ء میں طبع ہوا۔ اس میں نظم نما غزلیں، رباعیاں اور قطعات میں فلسفہ و شعر کی بڑی خوشگوار آمیزش ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی اشاعت کے بعد ایک اور فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' کے نام سے لکھی جو ۱۹۳۶ء میں طبع ہوئی۔ اور اسی سال ''ضربِ کلیم'' جو اردو کا تیسرا مجموعہ تھا شائع ہوا۔

اقبالؔ کی آخری کتاب ''ارمغانِ حجاز'' ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ فارسی رباعیات اور قطعات کے علاوہ اس میں چند اردو نظمیں بھی ہیں۔ وہ اور کئی کتابیں لکھنا چاہتے تھے لیکن موت نے انھیں مہلت نہ دی۔

اقبالؔ کا فن ظاہری اعتبار سے بھی پُرکار ہے اور جادو کا اثر بھی رکھتا ہے اس میں خاص حُسن ہے ان کا آرٹ لافانی ہے۔ انھوں نے غزل اور نظم کے فرق کو کم کر دیا اور جہاں نظموں میں غزلوں کی رنگینی پیدا کی وہیں غزلوں میں ہجر و وصال کے مضامین کے بجائے مسائلِ حیات کی عکاسی کا کام کیا۔ ان کے کلام کے مطالعے سے مندرجہ ذیل خوبیاں واضح ہوتی ہیں۔ اقبالؔ کا تخیل کبھی کبھی عرش کی بلندیوں پر سے گزر جاتا ہے۔ مثلاً ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمیں و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

اقبالؔ کا طرزِ بیان بہت مؤثر اور الفاظ کا انتخاب موزوں و مناسب ہوتا ہے جس سے کلام میں خاص طرح کی رنگینی و شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے جیسے ۔

شب سکوت افزا ہو آسودہ دریا نرم سَیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب

بیان کی خوبی اور جاذبیت ملاحظہ ہو۔

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز وتب وتاب اوّل سوز وتب وتاب آخر

اقبالؔ کی پوری نظمیں ایک جوش اور ولولے سے بھری ہوئی ہیں جیسے اس شعر سے ظاہر ہے۔

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو

فلسفیانہ انداز اقبال کے کلام کی جان ہے۔ اقبالؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شعر کو فلسفہ بنا دیا۔

بر تر اندیشۂ سود وزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

۱۹۲۴ء میں اقبال کو گُردوں کا عارضہ لاحق ہو گیا بے حد علاج کروایا گیا لیکن مکمل صحتمند نہ ہو سکے پھر اس کے بعد ۱۹۳۴ء کو ان کی آنکھوں میں موتیا بند بھی اُتر آیا۔ اس کی وجہ سے وہ بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ ۲۰/اپریل ۱۹۳۸ء کو رات میں ان کی طبیعت خراب ہونے لگی اور کچھ دیر بعد پانچ بجکر پانچ منٹ پر اس عالمِ جادوانی کو سدھار گئے۔ اور ۲۱/اپریل کو شاہی مسجد (لاہور) میں انھیں دفن کر دیا گیا۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کے اُڑ جائیں گے

لیکن بعض جانور اپنی سُریلی دُھن سُنا کر اُڑ جاتے ہیں جن کی آواز کی نہ بُھلانے والی یاد ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اقبالؔ بھی ان میں سے ایک تھے گو اقبالؔ اس چمن سے کب کے اُڑ گئے۔ مگر جب تک اُردو ادب زندہ ہے اقبالؔ یوں ہی شجرِ ادب پر بیٹھے چہچہاتے رہیں گے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس دل سے دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نسیاں وہ صدف کیا وہ گُہر کیا

شاعر کی نوا ہوکہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

(علاّمہ اقبالؔ)

جناب مصلح الدین سعدی صاحب (مرحوم)
کے خطوط کے پس منظر میں

تلاشِ اقبالؔ

ملٹن عیسائیوں کا شاعر ہے۔ اقبال ملی شاعر ہے۔ ان دونوں پر اپنے اپنے مذہب کا لیبل ہے اسی لیے لوگ انھیں زیادہ نہیں پڑھتے۔ بعض اُردو داں جو ذہین ہیں اور بھلے سے سیکولر ذہن رکھتے ہیں وہ بھی اقبال کو اس لیے نہیں پڑھتے کہ اقبال صرف اسلام کے شاعر ہیں۔ اس عصبیت کی وجہ سے وہ اقبال کی عظمت تک نہیں پہنچ پاتے، لیکن جب وہ کھلے ذہن سے اقبالؔ کو پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اقبال کی حقیقت کو کچھ حد تک جان لیتے ہیں تو پھر اس کی جستجو ان کا نصب العین بن جاتی ہے۔ اقبال کی فکر ایک انوکھی فکر ہے۔ الوہیت میں جذب ہونے کی فکر، وہ صرف عالم ہی نہیں، ایک فلسفی اور مفکر ہی نہیں بلکہ ایک رہنما بھی ہیں اور ایک عظیم شاعر بھی۔ ایک ایسا شاعر جو اپنے اندر صرف زبان کی تخلیقی صلاحیت ہی نہیں رکھتا بلکہ الفاظ کو ترنم بخشتا ہے اور اپنی دانست میں بار بار خدا کو چیلنج کرتا ہے۔ اس تک پہنچنے کی آرزو میں اقبال کے اس وصف سے جب ہم واقف ہو جاتے ہیں تو پھر اس کی عظمت ہمارے سامنے اُبھر کر آتی ہے۔ اس راز تک پہنچنے کے لیے اکثر لوگوں نے کئی برس لگائے ہیں۔ اب انھوں نے اقبال کو پڑھنا شروع کیا تو پھر ان کی آرزو رہی کہ اس کے پورے کلام کو پڑھیں اور اس کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہی حال علمی سرور جعفری کا ہوا۔ اختر حسین رائے پوری مجنوں گورکھپوری اور کیفی اعظمی نے بھی ایسی ہی باتیں کیں۔ انھوں نے کہاں تک پڑھا اور ان کا کیا ہوا ہم نہیں جانتے لیکن سردار جعفری اور ہمارے شہر کے عالم خوندمیری سے تو ہم واقف ہیں۔ انھوں نے اقبال کو پڑھنا شروع کیا تو نہ صرف اپنی رائے بدلی بلکہ دونوں ہی اقبالؔ کے اہم شارح بنے۔

اب ہم اقبال کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو اقبال کی حیات اور ان کے کارناموں کے علاوہ ہمیں اقبال کے شارحین کی مدد لینی پڑتی ہے اور اقبال کو کہاں کہاں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ پتنگ بازی اور کبوتر بازی سے لے کر علم و ادب کے میدان میں، شعر و شاعری میں، فلسفے میں، سیاسیات میں، مذہبیات میں، ملکی،

قومی' اور بین الاقوامی مسائل میں۔ ان کی اردو فارسی اور انگریزی تحریریں کسی ایک شعبے تک محدود نہیں ہیں' احباب کو لکھے خطوط پڑھیے' قوم سے خطاب پڑھیے' خطبات پڑھیے' سفرنامہ پڑھیے' غزلیں پڑھیے' نظمیں پڑھیے' مثنویاں پڑھیے۔ ان کے کلام میں ادب' فلسفہ اور پیام تلاش کیجئے یا مغربی و مشرقی شعریات کھوجیے' یہ سب کرنا نہیں چاہتے تو صرف ان نظموں اور غزلوں کو پڑھیے' جو غنائیت سے بھرپور ہیں۔ جن کی مثال ایک پہاڑی ندی کی سی ہے' جن میں بھرپور ڈرامائیت اور منظر نگاری ہے۔ ان سب سے جی نہ بھرے تو پھر آپ اقبال کے ساتھ اس دور میں چلے جایئے جو انھوں نے لندن اور جرمنی میں گزارا جہاں آپ کی عطیہ فیضی اور ایما ویگناسٹ ہی نہیں بلکہ کوئی آدھا درجن یورپین خواتین سے ملاقات ہوگی۔ پھر ہندوستانی دانشور مرد و زن بھی موجود ہیں۔ آرنلڈ جیسے عالم اور مشفق استاد بھی ہیں۔ پروفیسر سید سراج الدین نے سچ ہی کہا تھا۔ اقبال کے پاس ہر شخص کے لیے کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ اقبال کے ساتھ ایک دو دن نہیں پوری نصف صدی آپ گزار سکتے ہیں لیکن اتنی زندگی ہمیں کہاں ملتی ہے اور اگر مل جائے تو آپ اقبال کو ہر جگہ پائیں گے لیکن ایک گوشہ ایسا ہے جہاں پہنچ کر اقبال آپ کو چھوڑ کر ایسے ہی چلے جائیں گے جیسے ڈانٹے نے ورجل کو چھوڑا تھا اور یہ وہ گوشہ ہے جو مرد کامل کے انتظار میں ہے۔ جسے خودی کی تلاش ہے۔ یہ تلاش بڑی حسرت ناک ہے کسی کی تقدیر نہیں کہ اس بلندی تک پہنچ سکے۔ پہنچنا چاہو تو آپ کو وشوامتر بننا پڑے گا۔ پیر رومی کا سہارا لینا ہوگا۔ یہاں ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے تلاش کرنے والے کو چھوڑ کر اقبال آگے نہیں بڑھ جاتے۔ وہ تو ساری قوم اور دنیا کے تمام انسانوں کو اپنے ساتھ لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا پیام عالمی ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ آخری وقت تک کام کرتے رہے۔ چھوڑ کر آگے بڑھ جانے سے یہاں میری مراد اقبال کی فکر ہے۔ ''خودی'' سے متعلق اقبال نے کثرت سے شعر کہے ہیں اپنے چوتھے خطبے میں بھی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس شخص کو دوام کی تلاش ہے وہ اپنے اعمال کو اس طرح سنوارے کہ اس کی خودی بلندیوں کی اس سطح پر پہنچے جو اس کی آخری منزل ہو۔ وہ انائے مطلق سے یہ کہہ سکے جیسے جامی نے حضرت محمد صلعم کے تعلق سے کہا:

موسیٰ زِ ہوش رفت بیک جلوۂ صفات تو عین ذات می نگری و در تبسمی

(موسیٰ تو صفاتِ حق کی ایک جھلک دیکھ کر بے ہوش ہوگئے۔ آپ نے ذاتِ حق کا دیدار

مسکراتے ہوئے کیا) ظاہر ہے اس انوکھی فکر تک عام آدمی ہی کیا کسی خاص آدمی کا پہنچنا بھی سہل نہیں ہے۔ وہی اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ جو اپنی تقدیر کو بنانے کے اہل ہیں۔ تقدیر کی اپنی حقیقت کچھ ہو یا نہ ہو اہلیت پانے کے لیے کچھ اوزار اور کچھ اوزان درکار ہیں۔ میرا اشارہ ان ذرائع کی طرف ہے جو انسان کو کبھی فطرت سے ودیعت ہوتے ہیں اور کبھی سماج سے حاصل ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو یہ حاصل ہیں ان میں بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ان کے پانے کے لیے محنت کی ہوگی۔ ماضی اور حال اس کے گواہ ہیں۔ اقبال پر اس آخری خط کے لیے قلم اُٹھانے سے پہلے میں یہ سوچتا رہا کہ کوئی بھی شخص محنت و جستجو سے علم حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے ادراک کو بڑھا سکتا ہے اور ان دونوں کے توسط سے اقبال کو ہر جگہ پا سکتا ہے لیکن شاید ایک گوشہ ایسا ہے جہاں اقبال کی تلاش سعی ناکام ہے۔ وہ گوشہ ہے خودی کے تصور کا۔ کیا ذرائع ہیں ہمارے پاس خودی کو بلند کرنے کے؟ خود ''خودی'' کیا ہے ''شعور''؟ ''اَنا''؟۔ اگر یہی خودی ہے تو پھر یہ ہر شخص میں موجود ہے۔ کسی میں کم، کسی میں زیادہ، اور پھر انسان کے پاس وہ کیا ذرائع ہیں کہ اسے بلند کرے۔ جو خود دریا میں موج کی طرح ملت سے وابستہ ہے وہ بھی کچھ نہیں ہے ملت بھی تو اسے بگاڑتی اور بناتی ہے اور وہ شخص جو ملت کا قائد ہے اگر وہ بگڑا ہوا ہے تو پھر قوم کس حد تک گمراہ ہو جاتی ہے اس کی تاریخ گواہ ہے۔ آج ہمارے سامنے جو قائد ہے وہ اگر مخلص ہے تو باصلاحیت نہیں اور وہ جو باصلاحیت ہے وہ مخلص نہیں۔ ملت اور جماعت کا حال بھی وہ نہیں ہے جس کا تصور اقبال کے پاس تھا۔ لوگ یا تو بکھرے ہوئے ہیں یا پھر کسی پرچم کے تلے ہیں تو وہ پرچم ایک نہیں ہے۔ کوئی پرچم سرخ ہے، کوئی سبز تو کوئی سفید اور کوئی سیاہ اور پھر ادھر گزشتہ اسی نوے سال سے ملت اقبال کا کلام پڑھتی آ رہی ہے۔ خودی کے کرشمے سے واقف بھی ہے، پھر بھی افراد میں نہ تو ملت اسلامیہ کی حیثیت سے کوئی فرق آیا نہ کسی ملک یا ممالک کے افراد کی حیثیت سے۔ دنیا تو بہر حال چل رہی ہے۔ فوق البشر، مرد کامل یا مرد مومن کے تصور کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس طرح خودی ایک ناقابل رسائی تصور ہے۔ اس کے باوجود اقبال کے پیام خودی میں ایک دوسرا زاویہ بھی ہے۔ جس طرح میں نے اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے اسے قاری تک پہنچا رہا ہوں۔ اس کا مقصد کوئی سمت مقرر کرنا نہیں ہے۔ چند سوالات جو میرے ذہن میں ہیں ان پر گفتگو درکار ہے۔ نتائج اخذ کر لینا قاری کا کام ہے، جہاں تک خودی کو بلند کرتے ہوئے ابدیت حاصل کرنے والی بات ہے اس کے لیے شاید کسی روحانی تجربے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اسے یہ تجربہ حاصل ہے تو مجھے اس پر شک کرنے کا حق نہیں

ہے لیکن اسے قبول کرنا یا نہ کرنا میرا ذاتی عمل ہے۔ اس کی مجھے آزادی بھی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ انسان اپنے عمل کے ذریعہ اپنی خودی کو بلند کرسکتا ہے۔ آیئے دیکھیں مزید اس کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں اور دیگر مفکروں کی کیا رائے ہے۔

یہ دو شعر اردو کے ملاحظہ ہوں:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی
ندرت فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

اقبال نے بڑی وضاحت سے یہ بات اپنے خطبات میں کہی ہے کہ انسان کی انفرادی خودی کا انحصار اس کے احساسات، اس کی محبت و نفرت، اس کے فیصلے، اس کے عزائم اور عمل پر ہے۔ یہ سب اس کی ذات کا حصہ ہیں۔ خدا اس میں مداخلت کرنے والا نہیں ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ انسان کی جگہ خود محسوس کرے یا اس کے عمل کے فیصلے خود کرے یا اگر انسان کے لیے دو راستے کھلے ہیں تو اس کے لیے کوئی ایک راستہ متعین کرے۔

امام غزالی کو اسلامی فکر کا شارحِ اعظم سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے خودی کے بارے میں کہا کہ وہ ایک سادہ ناقابل تجزیہ و ناقابل تقسیم روحانی وجود حقیقی ہے جو مرور زمانہ کے ساتھ ہمارے بدلتے ہوئے ذہنی تاثرات سے بے تعلق ہے۔ ولیم جیمز نے اس کو شعور سے مختلف قرار دیا اور کہا کہ خودی ہماری شخصی زندگی اور ہمارے ذہن کا ایک حصہ ہے۔ اقبالؔ نے شعور کے تعلق کو نامناسب قرار دیا اور کہا کہ شعور کا عمل جزوی ہے اور وہ وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس طرح بدلنے والا عنصر ہمارے اس خیال کا ساتھ نہیں دے سکتا جو حال میں موجود ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ خودی کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جو ہمارے کثرت تجربات کے باہمی تصادم سے پیدا ہونے والی کیفیات سے بلند و بالا ہو۔ بلکہ وہ ہمارے تجربات ہی کا نتیجہ ہے لیکن یہ تجربات ہمارے باطن اور ہمارے ادراک کی کسوٹی پر جانچے گئے تجربات ہیں۔ اس لیے کہ ایسا کرتے ہوئے ہم خودی سے آشنا ہوتے ہیں ورنہ نہیں۔

الجھن اس وقت ہوتی ہے جب اقبال ابدیت کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابدیت اسی کو حاصل ہوتی ہے جس نے اپنی خودی کو بلندی کی آخری منزل تک پہنچایا۔ نہیں معلوم یہ ان کی فکر ہے یا عقیدہ؟ کہتے ہیں۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

جو خیال اوپر دیئے گئے شعر میں پیش کیا گیا ہے کیا ہم اس سے اتفاق کریں؟ کوئی شخص چاہے وہ اپنی خودی کو رفعت کی سی منزل پر لے جائے وہ تقدیرِ یزداں نہیں بن سکتا۔ اس شعر کو پڑھ کر سعی کامل میں لگے رہنے کی ایک پرزور تحریک حاصل ہو سکتی ہے۔ تقدیر پر تکیہ کیے بیٹھے رہنا ایک فعل عبث ہے لیکن یہ جو دوسرا شعر ہے (نظم ''صدائے غیب'' سے) اس سے ہم کہاں تک اتفاق کر سکتے ہیں۔

مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی روح کی منزل ہے آغوشِ لحد

یعنی صرف اسی شخص کو دوبارہ زندگی ملے گی جس نے خودی مطلق حاصل کی اور باقی دوسرے آغوشِ لحد میں فنا ہو جائیں گے۔ یا پھر اس شعر کی تعبیر کو بھی محض ایک استعارہ سمجھا جائے کہ اقبال کا پیام مردانِ حر کی تخلیق کے لیے ہے۔ لیکن ہم تو اقبال کے نظریہ ابدیت سے واقف ہیں۔ اس لیے اس شعر کو اس کے حقیقی معنوں ہی میں لیں گے۔

ابدیت کے خیال کے ساتھ ایک اور ہم سوال ابھرتا ہے۔ ہم میں کتنے ایسے انسان ہیں جو شعور اور انا کے تصور سے واقف ہیں۔ پس ماندہ کھانے کپڑے اور سائے کے محتاج لوگوں کے لیے خودی کے پہلے زینے تک بھی پہنچنا ناممکن ہے اور پھر ان ہستیوں کا کیا ہوگا جنھوں نے اپنے شعور اور اپنی انا کو بلند ترین سطح تک پہنچایا اور بڑی بڑی انسانی خدمات انجام دیں لیکن وہ اپنے عقیدے میں آخری وقت تک بت پرست رہے اور اسی حالت میں ان کی روح ان کے جسم کو چھوڑ کر چلی گئی؟

اب ایک اور گوشہ ہے جہاں عقیدے اور فکر کا ٹکراؤ ہے۔ اقبال کہتے ہیں

"Heaven and Hell are States, not Localities" یعنی جنت و دوزخ مقامات نہیں احوال ہیں۔ چوتھے خطبے کے آخری جملے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

"Nor is Heaven a holiday, life is one and continuous. Man marches always onward to receive ever fresh illuminations from an Infinite Reality which every miment appears in a new glory! And the recipient of Divine Illumination is not merely a passive recipient. Every act of a free ego creates a new situation and thus offers further opportunities of creative unfolding."

یعنی جنت کوئی تعطیل نہیں ہے۔ زندگی ایک ہے۔ جاری وساری ہے۔ انسان ہمیشہ آگے بڑھتا اور ذاتِ حقیقی سے نئی تجلیات حاصل کرتا رہتا ہے۔ ذاتِ حقیقی کی تجلی ہر لمحہ ایک نئی شان سے وارد ہوتی ہے۔ خدا کی ان تجلیات کو پا کر انسان مطمئن نہیں ہو جاتا۔ آزاد خودی کا ہر عمل نئے حالات پیدا کرتا اور نئے تخلیقی مواقع فراہم کرتا ہے۔

اس انگریزی عبارت کو آسانی سے سمجھنے کے لیے میں نے ذرا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ یہ خیال کہ جنت و دوزخ احوال ہیں بعض مذہبی رہنماؤں نے اقبال سے پہلے بھی پیش کیا' لیکن اب تو یہ خیال اقبال سے منسوب ہو گیا۔ یہ خیال عام نہ ہو سکا۔ کسی نظریے یا عقیدے کا عام نہ ہونا اس کی حقیقت کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے تاہم مقامات اور احوال میں وہی فرق ہے جو حقیقت اور تجرید میں ہے۔ خدا کی ساری مخلوق حقیقی ہے' وہ تجریدی نہیں ہو سکتی۔ تجرید کا تصور تو انسان کی اپنی ذہنی کیفیات سے ہے اور جس کی مدد سے اکثر وہ اپنے زخموں کا مداوا ڈھونڈتا ہے۔ خدا کی ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ وہ تجریدات کو جنم دے۔ اللہ' احسن الخالقین ہے اور وہ دوسروں کی تخلیق میں مداخلت کرنے والا نہیں۔ بہر حال یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ اب ہم لوٹتے ہیں اوپر دیئے گئے بیان کے دوسرے حصے کی طرف وہ ہے بقائے دوام کا تصور یہ تصور دوسرے مذاہب میں بھی ہے۔ دراصل روح اور حیات بعد الموت کا تعلق عقیدے سے ہے۔ ہندومت میں بھگوت گیتا کے مطابق جو پیدا ہوا ہے وہ مرے گا اور جو مرے گا وہ پیدا ہوگا۔ تو ریت نے یہودیوں کو بہ حیثیت کل یہ تیقن دیا ہے کہ خدا ان کی قوم کو کبھی نابود ہونے نہیں دے گا۔ وہ ان

کا محافظ ہے۔ انجیل کی تلاش دوسری ہے جو فرد ہی کے بارے میں ہے ان افراد کے بارے میں جو عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ انجیل میں ہے:

"For God so loved the world that he gave away his only begotton son, that whosoever believeth in him should not perish, but have everlasting life"

خدا نے دنیا سے اس طرح محبت کی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا اسے دیا۔ جو کوئی اس پر ایمان لائے گا وہ کبھی فنا نہیں ہوگا بلکہ دوامِ زندگی پائے گا۔

حیات بعد الموت کا تصور نطشے کے پاس بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال نطشے کے فوق البشر کے تصور سے زیادہ متاثر تھے لیکن انھوں نے اس کے حیات ابدی کے تصور سے اختلاف کیا۔ اقبال نے نطشے کا جو حوالہ پیش کیا ہے اس کا ترجمہ نذیر نیازی نے اس طرح کیا ہے:

''ہر شئے واپس آ چکی ہے۔ شعریٰ ہو یا مکڑی! اور یہ خیالات جو اس وقت تیرے دل میں ہیں اور یہ تیرا آخری خیال کہ ہر شئے واپس آئے گی۔ اے میرے ہم جنس تیری ساری زندگی شیشۂ ساعت (Sand Clock) کی طرح پر اور خالی ہوتی رہے گی اور یہ حلقہ جس میں تیری حیثیت ایک دانۂ ریگ (ریت کا کنکر) سے زیادہ نہیں ہمیشہ رخشاں اور تاباں رہے گا''۔

اقبالؔ نے نطشے سے اس بنیاد پر اختلاف کیا کہ وہ زمانے کو ایک خارجی کیفیت قرار دیتا ہے۔ اس اختلاف سے قطع نظر ہندوازم ہو کہ عیسائیت یا نطشے کا تصورِ ابدیت ان سب میں اور خود اقبالؔ کے تصورِ حیات بعد الموت میں جو مرکزی خیال ہے وہ مشترک ہے۔ وہ خیال ہے ''انسان کی بقائے ابدی'' کا لہٰذا اقبال اگر یہ کہتے ہیں ''حیات جاوداں اندر ستیز است'' تو ہمارے لیے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے لیکن انسان کے لیے ''جاوداں'' کا تصور اگر ایک عقیدہ ہے تو پھر اس میں اختلافات کی گنجائش کا انحصار مختلف مذاہب کے تصورات پر ہے۔ اس کے علاوہ عام طور پر انسان اپنے عقیدے کا پکا ہوتا ہے اور وہ جو کسی عقیدے کا اسیر نہیں ہے وہ بھی اپنی فکر الگ رکھتا ہے۔ کس کو کس پر فوقیت دی جائے؟ فوقیت نہیں دینا ہے تو یہ ساری بحث غیر اہم ہو جاتی ہے۔

یہاں میں ایک حوالہ ضروری سمجھتا ہوں۔ اقبال کا ہم عصر ایک یہودی فلسفی بھی گزرا ہے۔ اس نے لمبی حیات پائی تھی (1878ء تا 1975ء)۔ اس کا نام ہے مارٹن بوبر۔ اس نے اپنی قوم کے بارے میں ویسے ہی نظریات پیش کیے جیسے اقبال نے مسلمانوں کے لیے پیش کیے۔ یاسمین لودھی نامی ایک خاتون نے امریکہ کی پورڈے یونیورسٹی کے تحت اپنا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ پیش کیا تو دونوں فلسفیوں کی فکر میں یکسانیت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے ایک اہم بات کہی۔

"Individuals are God's gateway to the world"

(افراد دُنیا کے لیے خدا کا باب الداخلہ ہیں)

میں نہیں سمجھتا کہ جس باب الداخلہ کا اوپر ذکر ہے وہ ان دونوں فلسفیوں کی نظر میں ایک ہے۔ اقبال کے پاس ایک ایسا تصور بھی ہے جو اس رباعی میں بیان کیا گیا ہے:

Speak not about the world to me,
If it be not ; or if it be ;
I only know that I am,
The world illusion let go by.

کہا تو نے جہاں بے انت ہے اور تو ہے موجود
خدا کہتے ہیں جس کو وہ کہیں اصلا نہیں ہے
مگر مجھ پر ابھی یہ راز ہی کھلنے نہیں پایا
نظر کے سامنے جو ہے وہ ہے بھی یا نہیں ہے

اُردو ترجمہ: فارسی سے، مضطر مجاز

اس کے برخلاف مارٹن بوبر نے جو تصور پیش کی وہ یوں ہے:

"The land is mine, when conquerers settle a piece of territory He lends it to them and waits to see what

they will do with it,........ all flesh cries out in thy name; as Israel declares in its prayer for the kingdom of God".

ترجمہ: یہ زمیں میری ہے۔ کوئی فاتح جب اس پر قابض ہو جاتا ہے تو خدا وہ ٹکڑا اسے عطا کرتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ دیکھیں یہ لوگ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

''ساری حیات اسی کا نام لے کر پکارتی ہے'' خدا کی بادشاہت کا اسرائیل کے پاس یہی اعلان دعا ہے''۔

اب میں خودی کے تصور کی مزید پیچیدگیوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں نے پچھلے صفحات میں خودی کو تکمیل تک پہنچانے اور انسان کے دوام پانے کا ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک اقبالؔ کے تصور خودی کا نچوڑ یہ ہے:

ہم اپنی قوت ارادی سے مردِ کامل کے راستے پر چل سکتے ہیں۔ نیکی اور بدی کے عمل میں ہم مختار ہیں۔ اپنی ذات اور اپنی انفرادیت کو سنوارنے کا ہمیں پورا اختیار ہے۔ یہی انفرادیت تکمیل کو پہنچ کر خدائی انفرادیت سے قریب تر ہو سکتی ہے۔ یہ انفرادیت ہے خودی کو تکمیل تک پہنچانے کی۔ جس نے اپنی خودی کو تکمیل تک پہنچایا اس نے دوام پایا۔ دوام اور ابدیت کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح ہر روز بے شمار واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ان تمام واقعات کو تاریخ میں جگہ نہیں ملتی۔ جگہ وہی پاتے ہیں جن کی اہمیت ہوتی ہے۔ جو فعال ہوتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو تاریخ کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اپنی انا کی تعمیر کرتے ہیں۔

بے ذوقِ نمود زندگی موت ۔۔۔ تعمیر خودی میں ہے خدائی !
رائی زورِ خودی سے پربت ۔۔۔ پربت ضعف خودی سے رائی!

یہ ذوق نمود کیا ہے۔ یہ اپنے شعور اور اپنی انا کی تربیت ہے۔ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کی کاوش اور دوام کی تلاش۔ دوام کی تلاش خدا کی تلاش ہے لیکن خدا ابد ہے۔ یہ ابد کسی جسم یا جذبے کا نہیں بلکہ نور کا ہے۔ یہ نور ہے اس دنیا سے محبت کرنے کا۔ اس کو سنوارنے میں لگے رہنے کا۔ دل

گداختہ بنائے رکھنے کا۔ سمندر میں موج کی طرح تڑپنے کا۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

پر عمل کرنے کا۔ اگر ہم اس پر یقین نہ کریں تو یہ کائنات اور یہ زندگی بے معنی ہو جاتے ہیں۔

''آسمان اور زمین کے بنانے والے کی قسم..... یقیناً وہی مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کیا اور وہی نامراد ہوا جس نے اسے گناہوں میں چھپایا''۔ (سورۂ شمس)

اقبالؔ پر تمہارے لیے یہ میرا آخری خط ہے۔ تلاشِ اقبال ایک حقیر کوشش رہی۔ زندگی نے فرصت دی تو کسی وقت، خودی کے مسئلہ پر سر جوڑ کر بیٹھیں گے۔ تب تک کے لیے خدا حافظ

.....

''تلاشِ اقبال'' کا جو مضمون تم نے بھیجا ہے وہ میں نے پڑھا اور بہت پسند کیا۔ نیا انداز اختیار کیا ہے۔ اقبال کے فارسی کلام اور مغربی افکار سے استفادہ بھی خوب ہے۔ نطشے اور مارٹن بیوبر کے حوالے سے بات اور عمدہ ہو گئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

قدیر زماں نے اقبال پر یہ مضامین خطوط کی شکل میں تحریر کیے ہیں۔ کئی سال پہلے ادبی مسائل پر اظہارِ خیال کے لیے یہی اسلوب مجنوں گورکھ پوری نے اختیار کیا تھا۔ ان کے خطوط (پردیسی کے خطوط) کی مکتوب الیہ بھی ایک لڑکی تھی۔ قریب پانسو برس پہلے ایک صوفی بزرگ اور دکنی شاعر حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق نے اپنی ایک مرید لڑکی کو جس کا نام ''خوش'' تھا مخاطب کر کے یا اس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اور کبھی خود اس کی زبانی شریعت کے مسائل اور طریقت کے رموز پر روشنی ڈالی تھی۔ 'خوش نامہ' اور 'خوش تغز' ان کی منظوم تصانیف ہیں۔ قدیر زماں کی یہ کتاب بھی اسی روایت کی ایک کڑی ہے۔ قدیر زماں نے 1986ء میں جب پہلا خط لکھا طالبہ کم عمر لڑکی تھی۔ آخری خط 1999ء کا تحریر کردہ ہے۔ ان تیرہ برسوں میں جہاں طالبہ کا شعور پختہ ہوا وہیں خود قدیر زماں کا مطالعہ بھی وسیع ہوا، جس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے۔

تلاش اقبال، اقبال فہمی کی ایک انفرادی اور منفرد کوشش ہے۔ ان خطوط سے مکتوب الیہ نے یقیناً

استفادہ کیا ہوگا۔ کتابی صورت میں شائع ہونے کے بعد اقبالیات کے طالب علم اور اقبال کی شاعری اور افکار سے دلچسپی رکھنے والے بھی مستفید ہوں گے۔ یہ کتاب اقبال کی فکر کے بعض گوشوں کو روشن کرتی ہے اور اقبال فہموں کی غور وفکر کے لیے چند سوالات بھی پیش کرتی ہے۔

مغنی تبسم

تلاشِ اقبال (تبصرہ)

عالم اعظمی

''اقبال جدید دور کے ایک بڑے شاعر اور ایک بلند پایہ مفکر ہیں۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مختلف زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن ان کے فکر وفن کی تہہ تک بہت کم لوگ پہنچ سکے ہیں۔ ہر شخص اپنے مطلب کی باتیں نکال کر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے فکر اقبال کے صحیح خدوخال کو پالیا ہے.....'' بہ حیثیت مجموعی اقبال کی شاعری اور اس کی تنقید اور تجزیے سے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ خیال بڑی حد تک' صداقت پر مبنی ہے اور قدیر زماں کی نئی تصنیف ''تلاش اقبال'' کے مطالعے سے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اقبال کی شخصیت اور فن پر چار ہزار سے زائد کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اقبال کے ''بحر خیالات'' کے ''گہرے پانی'' کی شناوری کے ذریعے گوہر مراد کا حصول بہت کم لوگوں کا مقدر بن سکا ہے۔ قدیر زماں نے زیر تبصرہ کتاب میں اقبال کے مقام اور مرتبے کے تعین کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کلام اقبال کی تفہیم وتدریس کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے اور اقبال سے متعلق اپنی معلومات سے خط وکتابت کے ذریعے ایک ہائی اسکول کی طالبہ فاطمہ نوید مرزا (حال مقیم شکاگو) کو مستفید کیا ہے اور اس کتاب کو مذکورہ طالبہ کے نام معنون بھی کیا ہے۔ یہ کتاب جملہ 19 خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط دو حصوں میں منقسم ہیں۔ علاوہ ازیں کلام اقبال کی باتیں نظموں' قطعات اور رباعیات پر مشتمل انتخاب بھی کتاب میں شامل ہے۔ جو اقبال کی فکر خاص کا شناس نامہ بھی ہے اور مکتوب الیہ کے ذہنی معیار کے اعتبار سے قابل تفہیم اور مفید بھی۔ ''تلاشِ اقبال'' یوں تو اقبال کی زندگی کے اہم اور دلچسپ واقعات سے متعلق خطوط پر مشتمل ہے تاہم مکتوب الیہ کے تو سن فکر کو مہمیز لگانے کے لئے فلسفہ خودی' تصور خدا اور حقیقت دعا جیسے فلسفیانہ موضوعات بھی زیر بحث لائے گئے

ہیں۔اقبال کے ایک شعر:

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا　　میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

پر ایک دلچسپ اور فکر انگیز مباحثہ بھی کتاب میں شامل ہے جو مصحفؔ اقبال توصیفی اور مولانا سید نصرت عالم جیسے اقبال شناسوں کے زریں خیالات پر مشتمل ہے۔''تلاشِ اقبال'' یوں تو ہائی اسکول کی ایک طالبہ کے لئے لکھی گئی ہے لیکن دیانت داری کی بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب طلباء اور اساتذہ دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔اردو ناشناسی اور شعر و ادب سے عدم دلچسپی کے اس دور میں ان طلباء کے لئے خاص طور پر مفید ہے جو اقبال سے متعلق ضخیم اور عمیق تنقیدی کتابوں کے مطالعہ کا دماغ نہیں رکھتے۔ قدیر زماں نے بڑی سلیس' رواں' غیر شاعرانہ لیکن شستہ و شگفتہ زبان میں اپنے بیش قیمت خیالات کو پیش کیا ہے۔ان کی یہ کتاب بلاشبہ ذخیرہ اقبالیات میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر مغنی تبسم کی گرانقدر آرا نے کتاب کے وقار اور اعتبار میں مزید اضافہ کیا ہے۔

اپریل 2005

.....

23/ستمبر 2000

SAIYID HAMID, IAS (Retd)

Former Vice-Chancellor

Aligarh Muslim University

مخدومی' سلام و سپاس

''مخدومی'' پر اعتراض نہ کیجئے' بزرگی عمر سے نہیں عقل سے ہوتی ہے۔

''تلاشِ اقبال'' عنایت کر کے آپ نے مجھ پر احسان کیا۔مکروہات زمانہ میں گرفتار رہتا ہوں' اس لیے پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔لیکن آپ کی کتاب میں شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔کالی کٹ کے سفر میں وہ رفیق تھی۔

آپ کے رُخ اور اروش لہجہ اور پیرایہ پر رشک کرتا رہا۔ آپ کی تحریر میں نہ قطعیت ملی، نہ غلو، نہ جذباتیت۔ شائستہ، سنجیدہ، سلجھا ہوا، تحقیقی اور محتاط انداز۔

آپ لکھتے رہیے (یہاں سن وسال کا فائدہ اٹھا رہا ہوں)۔ کیا عجب کہ آپ نے بہت کچھ لکھا ہو بھی۔ ایک بار پھر ہدیہ تشکر قبول کیجئے، اپنی اور فاروقی صاحب دونوں کی کتابوں کے لیے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ فاروقی صاحب کی کتاب پر میں نے انگریزی میں جو مضمون لکھا تھا آپ اسے دیکھتے۔ اس میں آمد زیادہ تھی۔ مگر اب وہ میری دسترس میں نہیں ہے۔

والسلام

خیراندیش / سید حامد

شکاگو 2002ء

''عزیز مکرم قدیر زماں صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پچھلے سال جون میں میرے حیدرآباد کے مختصر دورے۔ میں آپ نے ازراہ کرم اپنی کتاب ''تلاشِ اقبال'' کا جو تحفہ عنایت کیا تھا وہ سمندری راستے سے کل یہاں پہنچا۔ وہ تمام کتابیں جو مجھے تحفے میں ملی تھیں حسامی بک ڈپو کے ذریعے بھیجی گئی تھیں (شاید تاخیر سے) میں نے پارسل کھول کر کتابوں کے عنوان دیکھے اور پھر آپ کی کتاب رات دیر گئے تک پڑھتا رہا اور آج فجر کے بعد شروع کر کے بھی اس کو ختم کیا ہے۔ میں عموماً تیز خواں ہوں لیکن اقبال کی شاعری سے نوٹس لینے کی عادت ہے۔ اقبال کے اشعار تو میری کئی Serap Books میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن نثر کے جواہر پاروں کا جو انتخاب آپ نے کیا ہے وہ اقبال کی ایک بڑی خدمت ہے۔ میرے بھائی ڈاکٹر کاظم حسین نے اچھے جملوں کو انڈر لائن بھی کر دیا ہے۔ اس لیے مجھے اور آسانی ہوئی۔ مجھے کتاب بے حد پسند آئی۔ کاش ہماری نئی نسل ان جیسی کتابوں کو پڑھ سکتی۔

1938ء میں جب میں جامعہ عثمانیہ میں شریک ہوا تو اقبالؔ کا انتقال ہو چکا تھا۔ جون یا جولائی میں داخلوں کے بعد ان کا تعزیتی جلسہ ہوا اور اس میں پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے جو تقریر کی تھی اس میں عطیہ بیگم فیضی کی طرح ان کو ایک بھرپور رنگین مزاج انسان کے روپ میں پیش کیا تھا نہ کہ ایک

خدارسیدہ خشک مزاج بزرگ کی طرح۔ ہم اکثر اپنے بڑے لوگوں کو رحمۃ اللہ علیہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (اس کے بعد زبان' الفاظ اور رسم خط کے بارے میں لکھا ہے)

ایک مصرعے کے ترجمے کے بارے میں مجھے کچھ شبہ ہے۔ صفحہ 28 پر:

دردشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

کے معنی کیا یہ نہیں ہیں کہ میرے دشتِ جنوں میں جبریل اسیر (یا تھکا ہوا) ہو چکے۔ اب اے ہمتِ مردانہ یزداں پر کمنڈ ڈال۔

ممکن ہے کہ میں غلط ہوں۔ میں نے فارسی صرف ساتویں تک پڑھی تھی لیکن حافظ' سعدی اور اقبال کو پڑھتا رہا۔

کیا آپ کے خط اس ذہین سانولی لڑکی کے نام نہیں جس سے میں شکاگو میں آپ کے گھر ملا تھا۔ اب آپ کب یہاں آئیں گے۔

کیا بھائی راما کرشنیا کی کتاب "Historical Memories" شائع ہو چکی ہے۔ ان سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے۔ آج کل جعفر نظام اور مغنی تبسم امریکہ میں ہیں۔ سراج کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ کتاب کے دانش ورانہ تحفہ کا شکریہ

مخلص

سید ہاشم علی اختر

.....

14-Nov-2000ء

Dear Kadir Sahb,

Adab

I Look forward to reading your book on Allama

Iqbal, I have also a little about his concept of Khudi in the intro of my translation of Shakva & Jawab-e-shakva published by O.U.P. Your's

Khuswant Singh

N.B Your Book has arrived. Thanks

....

رؤف خیر، ایم۔اے، لکچرر،

27/جولائی 2000ء

جناب قدیر زماں صاحب

آداب عرض

آپ کی کتاب ''تلاش اقبال'' ایک کرم فرما سے مستعار لے کر پڑھی۔ چوں کہ مجھے علامہ اقبال سے دلچسپی ہے اس لیے ان پر لکھی ہوئی اور ان کی لکھی ہوئی تخلیقات پڑھتا رہتا ہوں۔ اقبال کی فکر کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور اگر کوئی ان کی فکر کی توضیح وتشریح کرتا ہو تو وہ میرے لیے لقمہ تر لگتا ہے۔

آپ نے بڑی محنت سے کئی کتابیں خود پڑھیں، کئی ''اقبالیوں'' سے بحث وتمحیص کے بعد جو مواد پیش کیا وہ اقبال سے طالب علموں کے لیے تقریباً Ready Reference کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی زندگی کے بعض اہم حالات (نجی) اور ان کی تصنیفات کی تفصیل ان کے اساتذہ اور ان کے دوستوں کے بعض گوشے پر لطف ہیں۔

آپ نے ''اقبال کا عہد'' میں اقبال کے ہم عصروں کی جو تفصیل سن داری دی ہے وہ بہت اہم ہے بعض حیرت ناک انکشافات بھی ہیں جیسے عطیہ فیضی کا گاندھی جی کی انگلی میں پن چبھو کر خون سے آٹو گراف لینا۔ ان کا انا میری شمل کی داد دینا وغیرہ۔

آپ نے اقبال کے تیسرے خطبے (تصور خدا اور حقیقت دعا) کو بہت آسان بنا کر پیش کیا۔

انگریزی تو بہت مشکل ہے ہی، نذر نیازی والا ترجمہ تو اس سے زیادہ مشکل ہے۔

یہ خطوط Pre-planned ہو کر رہ گئے ہیں۔ مکتوباتی ادب میں ''غبار خاطر'' پر جتنے اعتراضات کیے گئے ہیں، آپ پر ان سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ آپ نے بال جبریل کو ''بال جبرئیل'' کر دیا ہے۔ یہ اگر کمپوزنگ کی غلطی ہے تو بھی پروف ریڈر ذمہ دار ہے اور بالآخر مصنف پر اس کا وبال آئے گا۔ انا میری شمل کا یہ فرمانا کہ ''خدا اور قیامت سے متعلق کوئی بات قطعی نہیں کہی جا سکتی'' آپ کی فکر کے عین مطابق سہی، اسلامی فکر کے مغائر ہے۔ خدا اور روزِ قیامت پر ایمان لانا اسلام کی مبادیات میں سے ہے۔

پندرھویں خط میں آپ نے لکھا کہ اقبال کے جمع کردہ انگریزی نوٹ (اندراجات) کا ترجمہ ''شذراتِ اقبال'' کے عنوان سے پاکستان میں پہلے چھپا اور اس کے بعض اچھے جملے فقرے آپ نے کوٹ کیے ہیں۔ لکھا گیا کہ ''نیک لوگ اکثر غنی ہوتے ہیں'' اصل میں ''غنی'' کی جگہ ''سادہ لوح'' کا لفظ آنا چاہیے جس میں ان کا غنی ہونا بھی شامل ہو سکتا ہے۔

آپ نے منتخب نظمیں دی ہیں وہ اقبال کی پہچان ہیں۔

چودھواں خط تو کسی صورت سے خط نہیں لگتا یہ تو ایک اجلاس کی پوری تفصیل ہے۔ اگر آپ نے پہلے یا آخر میں فاطمہ (مکتوب الیہ) کو یہ لکھا ہوتا کہ میں یہ رپورٹ من وعن بھیج رہا ہوں تو یہ خط شمار کیا جا سکتا۔ اس رپورٹ میں مصحف اقبال اور نصرت عالم صاحبان کے خیالات کے لیے آپ ذمہ دار نہیں۔

اگر ممکن ہو تو ایک جلد ''تلاشِ اقبال'' مجھے عنایت فرمایئے۔ آپ کا اپنا

نوٹ: خط کی عبارت طویل ہے مختصر شائع کیا گیا۔ اختلافی رائے شامل ہے۔ رؤف خیر

انل ٹھکر

25/مئی 2000ء

قبلہ آداب

آپ کی انگلی پکڑ کر ابھی ''تلاش اقبال'' کے سفر میں ہوں۔ شذراتِ اقبال والے

باب میں صفحہ 93 پر ساتویں سطر میں لکھا ہے ''قومیں شاعروں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں اور اربابِ سیاست کے ہاتھوں پروان چڑھتی اور فنا ہوتی ہیں''۔

حضرت تقریباً بیس سال پہلے مقامی کالج کے نوٹس بورڈ پر ''آج کا خیال'' کے عنوان سے مجھے انگریزی کے مشہور و معروف ادیب کا ایک فقرہ ترجمہ کرنے کو کہا گیا۔ اب مجھے اس ادیب کا نام یاد نہیں رہا۔ البتہ وہ خیال میری ڈائری میں محفوظ ہے۔ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں

"Nations are born in the Hearts of poets, they prosper and die in the hands of the politicians"

کیا یہ خیالوں کا حیرت انگیز ٹکراؤ نہیں ہے؟ اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ نیازمندی

انل ٹھکر

.....

15/مئی 2000ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر قدیر زماں صاحب

سلام مسنون

خطبات اقبال میں اقبال نے ایک اصطلاح استعمال کی ہے "Reflective Synthesis" اس کا اردو میں ترجمہ کرتے ہی یہ محدود ہو جاتی ہے۔ یہ اصطلاح فلسفہ، مذہب، ادبی تنقید اور سماج علوم کے مفاہیم پر حاوی ہے۔ آپ کی کتاب اقبال کی تلاش میں کئی مقام ایسے ہیں اور آپ کے بہت سے اندیشے جو ''عقل خالص'' کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں اور کہیں کہیں ایک سوال کی صورت میں بھی سامنے آتے ہیں ان پر غور کرنے کے لیے اس اصطلاح سے شاید مدد مل سکے۔ اگر سوال صحیح طور پر مرتب ہو جاتا ہے تو مسئلہ کا احاطہ اور گفت و شنید میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ سوال کرنا جواب دینے سے زیادہ مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔ غور و فکر کے دوران بسا اوقات ارتکاز کی کمی کی وجہ سے ہم سارے Issues کو Identify نہیں کر پاتے اور ہم کو اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری

پیاس کا سراغ نہیں ملتا' اسی وجہ سے ہم اپنی تشنگی کو ہی حاصل جستجو سمجھتے ہیں۔ اگر علم کی طلب میں یہ طریق کار ہے تو خیال افروزی کے ساتھ ساتھ خرد افروزی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ تمہید تو آپ کو Warm up کرنے کے لیے تھی آپ دیکھیں "Reflective Synthesis" کیا ہے۔
اقبال پہلے خطبہ میں بظاہر بہت ہی آسان سوالات سے بحث کا آغاز کرتے ہیں۔

1) ہم جس کائنات میں رہتے ہیں اس کے افعال کیا ہیں۔

2) اس کی ہیت ترکیبی میں کیا کوئی ایسی چیز پائی جاتی ہے جو اس کو ہمیشہ باقی رکھ سکے۔

3) ہمارے اطراف جو کائنات ہے اس سے ہم کس طرح جڑے ہوئے ہیں۔

4) اس کائنات میں ہمارا مقام کیا ہے۔

5) کس قسم کا طرز عمل ہمیں اس کائنات کے بارے میں اختیار کرنا چاہئیے جو ہمارے مقام کے شایانِ شان ہو سکے

اقبال کا خیال ہے کہ یہ سوالات فلسفہ' مذہب اور اعلیٰ شاعری میں مشترک ہیں (کیا واقعی ایسا ہے) اگر یہ بات قابل قبول ہے تو کیوں ہے۔ اور اس سے انکار ہے تو کیوں۔ ان دو سوالات سے قطع نظر ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے ہاں اصلی یا عظیم شاعری کی اہمیت مذہب اور فلسفہ سے کم نہیں تھی۔ شاعری کے بارے میں وہ خاصے سنجیدہ ہیں' ایک ایسا آدمی ہی اس رائے کے بارے میں اختلاف یا اتفاق کر سکتا ہے جس نے مذہب' فلسفہ اور اعلیٰ شاعری کا تفصیل سے مطالعہ کیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ تخلیقی فکر اپجی (Original) ہوتی ہے وہ ہر لمحہ نئے زاویہ نگاہ اور نئے تجربوں کی متقاضی ہوتی ہے۔ اقبال نے سوالات مرتب کیے اور ان پر سنجیدگی کے ساتھ ایک رائے ظاہر کی۔ اس ایک جملہ کو لکھنے کے لیے ایک ایسی شخصیت مطلوب تھی جس کی مذہب' فلسفہ اور اعلیٰ شاعری پر ماہرانہ دسترس ہو۔ ہم اقبال کی شاعری اور اس کے فلسفہ کے بارے میں آئے دن بہت کچھ کہتے سنتے رہتے ہیں' ذرا غور کر کے بتایئے اس گفتگو یا تحریر کے دوران کتنے لوگوں نے ان سوالات کی گمبھیرتا کو اپنے سامنے رکھا۔ ہم عظیم شاعری کی بھی تعریف کرتے ہیں' اگر ایک سوال کیا جائے کہ بیسویں صدی کے تین عظیم شاعر (اردو کے) فیض احمد' ن۔م۔ راشد اور اختر الایمان نے اپنی پوری تخلیقی فکر میں ان سوالات کو کیا اہمیت دی ہے تو ہم کو ایک

نئے تنقیدی تجربے سے گزرنا پڑے گا۔ نئے انداز کے تجزیے ہوں گے' انسانی فکر کی توریثی ساخت میں ان کے مقام کا تعین کرنا پڑے گا۔ Orignality عظمت کے مفہوم کو تب ہی متعین کیا جا سکے گا۔ عصری تنقید نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اگر آپ کے علم میں ہے تو مجھے استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ آپ شاید اس مقام پر یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں ۔Reflevtive Synthesis پر گفتگو کرتے ہوئے یہ کہاں کی دور از کار بحث چھیڑ دیا ہوں لیکن مجھ سے اپنے میں اس اصطلاح کو عملی طور پر برتنے کی کوشش کر رہا ہوں' منطقی تنظیم معاون بھی ہوتی ہے اور گمراہ کن بھی خیال کی رو سے بچتے ہوئے افہام و تفہیم' تخیل و تجزیہ ------ اُصولوں کے مغائر سہی لیکن اس غلطی میں کوئی گوہر ہاتھ لگ جائے تو محنت رائیگاں نہیں ہوتی۔

اقبال کا خیال ہے کہ ان سوالات کے جواب فلسفہ کے ذریعہ ملتے ہیں' مذہب کے ذریعہ بھی اور اعلیٰ شاعری کے ذریعہ بھی۔

پھر وہ اک ایک شعبہ کے بارے میں اپنی رائے لکھتے ہیں۔

1)۔ شاعرانہ واردات سے جو علم حاصل ہوتا ہے' انفرادی ہوتا ہے یعنی اس شخص سے مختص جس پر یہ واردات طاری ہوں یہ تمثیلی ہوگا۔ مبہم اور غیر قطعی۔

2)۔ مذہب کے مدارج عالیہ شاعری سے بلند تر ہیں وہ خرد سے جماعت کی طرف بڑھتا ہے اور حقیقت مطلقہ کے بارے میں ایک ایسی روش اختیار کرتا ہے جو حدود انسانی سے ٹکراتی ہے اور اس کی دعاؤں کو وسعت دیتی ہے وہ ہمیں توقع دلاتا ہے کہ ذات مطلق کا بلاواسطہ لقا ممکن ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسفہ کے خالص عقلی منہاج کا اطلاق کیا مذہب پر بھی ہو سکتا ہے۔

3)۔ فلسفہ کی روح ہے آزادانہ تحقیق۔ وہ ہر ایسی بات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے جس کی بناء ادعا اور تحکم پر ہو۔ اس کا منصب یہ ہے کہ فکر انسانی نے جو مفروضات بلا جرح و تنقید قبول کر رکھے ہیں ان کے مخفی گوشوں کا سراغ لگائے۔ معلوم نہیں اس جستجو کی انتہا کیا ہو۔ انکار یا اس امر کا صاف اعتراف کہ عقل محض کی رسائی حقیقت مطلقہ تک ناممکن ہے۔

اس مرحلہ پر اقبال کا ایک مشہور شعر بھی یاد آ گیا

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا　　حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

ان مفروضات پر آپ کے ردعمل کے بعد گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا۔ آج کی ملاقات میں اسی قدر کافی ہے۔

مخلص

مصلح الدین سعدی

.....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دوسرا خط مئی ۲۰۰۰ء

برادر قدیر زماں صاحب

سلام مسنون

میرا پہلا خط Reflective Synthesis کے سلسلہ میں تھا' یہی سلسلہ ابھی جاری ہے' میں شہر کے لوگوں سے کم ملتا ہوں' ایک تو فاصلوں کی وجہ سے بھی لوگ کم آتے ہیں دوسرے میرے پاس ان کی دلچسپی کے سامان بھی کم ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ مل بیٹھنے میں مزا آتا ہے جو موت جیسی حقیقی واردات کے زیر اثر نہیں ہوتے۔ زندہ لوگوں کی صحبت کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ابھی حال میں ایک محفل میں خیامؔ' غالبؔ' اقبالؔ' مولانا رومؔ اور ڈاکٹر عالم خوندمیری سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے اپنی کتاب اقبال کی تلاش میں بعض سمینارس کا ذکر کیا ہے' اس کی بعض اہم باتیں جو آپ کے دماغ میں محفوظ ہیں ان کو دہرایا بھی ہے' میں بھی یہ کچھ کرنے جا رہا ہوں۔

اقبالؔ صاحب تبریزی کا ایک شعر اپنے مخصوص ترنم میں گنگنا رہے تھے۔

عشق بے پروا چہ می داند زیان و ودرا　　شعلہ یکساں می شمارد چوب بید و سودرا

اس کا ترجمہ کچھ ایسا ہوگا عشق اپنی بے نیازی کی وجہ سے نفع و نقصان سے بے پروا ہو جاتا ہے' وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا جیسے شعلہ' عود کی لکڑی اور بید کی لکڑی میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔ اس کا کام تو جلانا ہے اس لیے وہ ان کی قدر و قیمت سے بے نیاز ان دونوں کو ایک ہی سمجھتا ہے اور جلاتے رہتا ہے۔

محفل میں ایک سماں بندھ گیا تھا۔ صاحب کا شعر اقبال کے پڑھنے کا انداز محفل میں ایک سے ایک باکمال موجود سب ہی ایک کیف کے عالم میں تھے۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری اقبال سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے' آپ نے بھی تو ایک شرر کا ذکر کیا ہے لیکن شعلہ کچھ اور ہی طبعی کیفیت کے ساتھ تفکرانہ گہرائی بھی اس میں موجود ہے اور حیرت ہے کہ اردو' فارسی' عربی میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ آپ نے انگریزی کے لفظ Spark کو اردو میں کس خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

غالب نے شعر سن کر کہا خاک میں شرر کا ہونا عام حالات میں محالات سے ہے شرر کہہ کر آپ نے خاک کے معنی بھی بدل دیئے ہیں اس طرح اپنے مفہوم کو نادر بنا دیا۔

عالم صاحب نے غالبؔ سے کہا کہ اس نکتہ کی وضاحت آپ ہی کر سکتے تھے۔ خاک میں واقعی کوئی ندرت نہ تھی لیکن اس تشریح کے بعد خاک کا مفہوم سمجھ میں آ گیا۔ اصلی طاقت کا سرچشمہ ظاہری اسباب سے ہٹ کر کچھ اور ہی ہے' اسباب و علل کے نظام میں جو فکر غلطاں رہتی ہے وہ اس Spark کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتی۔ اقبال مسکراتے ہوئے عالم صاحب اور غالبؔ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مولانا روم کے چہرے سے بشاشت کے آثار نمایاں تھے جیسے وہ اس گفتگو سے بے حد محفوظ ہو رہے ہوں۔ میں نے عالم صاحب سے پوچھا کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو اس محفل کی بعض خبریں آپ کے دوست قدیر زماں صاحب تک بھی پہنچا دوں' عالم صاحب نے چپکے سے کہا' ضرور ضرور' آپ اپنے آئندہ خط میں اس سلسلہ میں مختصراً تذکرہ کیجئے۔ قدیر زماں کی کتاب اقبال کی تلاش میں زماں و مکاں پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ آپ میرے مقالے کے آخری دو صفحات بھی ان تک پہنچا دیجئے۔ Reflective Synthesis کی ایک شکل یہ بھی ہے۔ چنانچہ اس خط کے ساتھ وہ دو صفحے بھی بھیج رہا ہوں۔ رسید سے مطلع کیجئے۔

مخلص

مصلح الدین سعدی

وضاحت:

میں ممنون ہوں مصلح الدین سعدی صاحب کا کہ انھوں نے ''تلاشِ اقبال'' کے ایک گوشے پر اقبال کے حوالے سے چند اہم سوالات اٹھائے۔ موقع ملتا تو موصوف سے میں مزید استفادہ کرتا۔ اب بھی کئی ایسے احباب ہم میں موجود ہیں جو ان مسائل کا ادراک رکھتے ہیں۔ اس بحث کو یہاں پیش کیا جارہا ہے اس لیے نہیں کہ نتیجہ اخذ کیا جائے۔ بحث جاری ہے تو ذہن ستیز رہ سکتے ہیں۔

Reflective Synthesis کے بارے میں اقبال کے خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے کہا گیا کہ ان سوالات کا تعلق فلسفے، مذہب اور شاعری میں مشترک ہے۔ اعلیٰ شاعری اقبال کے بال مذہب اور فلسفے سے کم نہیں۔

ناچیز کا خیال ہے کہ مذہب اور فلسفہ بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ شاعری ادبی ہو کہ اعلا اضافی ہے۔ مذہب و فلسفے کی اساس پر زبان و بیان کی وساطت سے اعلا شاعری کی تخلیقی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے۔ شاعری ہو یا کوئی اور فن اس کا سرچشمہ فلسفہ ہی ہوگا۔ تخیل بھی فلسفہ کی دین ہے۔ مذہب کا تصور بھی فلسفے ہی سے وجود میں آتا ہے اور اس طرح ساری فوقیت سائنسی ایجادات کی ہو یا دیگر اصنافِ کے انکشاف کی ان کا ذریعہ فلسفہ ہے یا پھر سماوی واقعات جو وقفے وقفے سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں مذہب یا عقیدے سے جوڑا جاسکتا ہے۔ عشق بھی ایک تصور حیات ہے۔ انسان کو شاید اس کی پہچان ہے۔ یہ پہچان بھی تصور کے راستے سے ہے۔ اس کے اظہار کی شدت الفاظ یا اعمال ہو سکتے ہیں جن کی حیثیت اضافی ہی ہے۔ اصل ہوتی تو اس میں یکسانیت ہوتی۔ حسد، غصہ، نفرت، حقارت اور اسی طرح کے دیگر جذبات کا وجود بھی ہے۔ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں یکسانیت نہیں ہے تو پھر عشق بھی تو ایک جذبہ ہے۔ وہ اندھا بھی ہوتا ہے۔ معشوق حاضر ہو یا غائب فرق نہیں پڑتا۔ اس کی منزل تصور ہے۔ اس تناظر میں تصور اور عقیدے کی توجیح کیسے کریں۔ ویسے منطق کے سہارے کچھ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ خود منطق ہی منطق کو قبول یا رد کرسکتی ہے یہ فلسفہ کی ایک شاخ ہے فلسفہ نہیں۔ بعض جذبات اپنی انتہا کو پہنچ کر عقیدے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ فلسفہ بہ نفسہ (Pense) یکسانیت کا حامل نہیں ہوتا۔ فلسفہ کی سطحات (Levels) ہیں اسی طرح جذبات کے بھی سطحات ہیں۔ جذبات کی بھی ایک منزل پر پہنچ کر جذبہ کٹر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ذہن کو آخری وقت تک کھلا رکھیں لیکن یہ وہی کرسکتے ہیں جو اپنی خودی کو بلند کرسکیں۔ اقبال کے پاس خودی کا تصور مادی و

روحانی نفع نقصان سے پرے ہے ورنہ کئی عظیم شاعر ایسے گزرے ہیں جن کے عقیدے الگ الگ ہیں۔ شاعر ہی نہیں بلکہ فلسفی بھی ہیں۔ میں دو چار کے نام لے لیتا ہوں' ڈانٹے' مارٹن بیوبر' بھرتری ہری' رابندر ناتھ ٹیگور' ان میں آپ رومی' سعدی اور حافظ وغیرہ کو بھی شامل کر لیں۔ ان سب کے نہ عقیدے ایک ہیں اور نہ ہی فکر۔

اقبال کی فکر ان اشعار میں کیوں نہیں تلاش کی جاتی۔

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں — تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

مزید دو شعر: بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی

رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

ضمناً یہاں ایک بحث چھیڑی جا سکتی ہے۔ فلسفہ کا در ہر موضوع اور ہر موقع پر کھلا رہتا ہے۔ مذہب کتنا ہی وسیع النظر سہی ایک مقام پر پہنچ کر اپنی کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیتا ہے۔ فلسفے میں مذہب کے کسی بھی تصور پر بحث کی گنجائش ہے لیکن مذہب ایقان کی بدولت اپنے حدود مقرر کر چکا ہے۔

نوٹ:۔ ایک اور موقع پر میں نے فلسفے کے مقابلے میں جب قدیر زماں کی عظمت کو بڑا قرار دیا ہے۔ یہ عین اقبالؔ کی فکر کے مطابق ہے۔ یہ چند سطریں اگلے صفحے پر ملاحظہ ہوں۔

جناب محترم قدیر زماں صاحب

سلام مسنون

راقم کو آپ کی تصنیف ''تلاش اقبال'' کی اشد ضرورت ہے۔ عرصے سے تلاش میں ہوں۔ دہلی سے تلاش کرائی نہیں ملی۔ کوئی صورت اس کی دستیابی کی؟ قیمتاً ملے تو رقم پاکستان میں' جسے لکھیں بھیج دوں۔ آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ مایوس نہیں ہوں۔ خیر اندیش

رفیع الدین ہاشمی

''ادب کا کینوس''

''اقتباس .....اس بحث سے قطع نظر آیئے دیکھیں خود اقبالؔ اس بارے میں کیا کہتے

ہیں۔ پیش نظر ہے: Stray Reflections (شذراتِ اقبال) یہ کتاب اقبال اکاڈمی پاکستان سے انگریزی میں 1961ء میں چھپی ہے اور اقبال اکاڈمی حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہاں اس کے اردو ترجمے بھی موجود ہیں۔

صفحہ 131 ملاحظہ ہو۔ انگریزی متن ہے:

"Science, Philosophy, Religion all have limits. Art alone is boundless."

(سائنس، فلسفہ، مذہب کے حدود ہیں۔ صرف فن ہی لامحدود ہے) ترجمہ: ڈاکٹر عبدالحق۔

اب اگر اقبال کی فکر اہم نہیں ہے تو میری یا آپ کی دلیلیں کیسے قابل قبول ہوسکتی ہیں۔ انسان کی ذہنی تربیت فلسفے سے زیادہ ادب سے ہوتی ہے۔ فلسفہ عقلیت کا طرف دار ہے۔ وہ مادیت کی طرف راغب کرتا ہے۔ ادب نہ صرف حسن و جمال کی کیفیات سے مالا مال ہے بلکہ اس میں بقا و فنا کی کیفیات متوازی ہیں۔ ادب کی جتنی بھی پرتیں ہیں وہ ابھی پوری کھلی نہیں ہیں ہم ابھی تک سنگ میل کے ان نشانوں تک نہیں پہنچے جنہیں ادب کے عظیم فن کاروں نے گاڑ دیا ہے۔ شاید ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ادب کا کینوس زمین پر نہیں آسمان پر پھیلا ہوا ہے۔

میں کوئی دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ دراصل ایک خیال صاحبانِ فکر و نظر کے سامنے رکھا ہے کہ اس پر غور کریں ورنہ کوئی بھی دلیل سب کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

❁❁❁

محمد طالب جلال ندوی

علامہ اقبالؒ کا تصورِ اتحاد

علامہ اقبال نے اُمت اسلامیہ کو ہمہ گیر سطح پر جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری اُمت اسلامیہ کی تاریخ میں جامعیت کے لحاظ سے عدیم المثال شاہکار ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مختلف جہات سے اتحاد و یگانگت کا سبق دیا۔ وہ اپنی نظم 'بزمِ انجم' میں باہمی اتحاد کو ستاروں سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے — جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے — پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

علامہ اقبال اُمت اسلامیہ کے اتحاد میں مغربی تصورِ قومیت کو نہایت تباہ کن خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رنگ، نسل، وطن، ذات، اور برادری اسلامی اتحاد قائم کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اُمت اسلامیہ کا اتحاد و وحدت مذہب و تمدن پر قائم ہے۔

اس سلسلے میں علامہ اقبال اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ''قدیم زمانے میں 'دین' قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار دیا، جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیوٹ ہے۔ جس میں انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن 'اسٹیٹ' ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ 'دین' نہ قومی ہے نہ نسلی ہے، نہ انفرادی اور پرائیویٹ' بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد یا وجود فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد اور منظم کرنا ہے''۔

علامہ اقبال جس قومیت کے قائل ہیں، اس کا دائرہ اسلام کے اندر اور اس کی بنیاد وہ دینی معتقدات پر رکھتے ہیں۔ لہذا وہ کہتے ہیں۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں، تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

وہ مزید کہتے ہیں کہ ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

وہ مزید کہتے ہیں کہ:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

وہ مزید کہتے ہیں کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کم زور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اسلام کا نصب العین ہی یہ ہے کہ اجتماعیت و اتحاد قائم کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کے الفاظ میں: لااسلام الا بالجماعة ولا جماعة الا بالامارة ولا امارة الا بالطاعة ''جماعت کے بغیر اسلام نہیں اور امارت کے بغیر جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں''۔

وہ مسلمانوں کو ایک ملّت میں گم ہو جانے کا درس دیتے ہیں اور ایک عالم گیر ملّت کے قیام کی خواہش رکھتے ہیں جس کا خدا، رسولؐ، کتاب، کعبہ، دین اور ایمان ایک ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

وہ اجتماعیت واتحاد کی اہمیت کو بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فرد را ربط جماعت رحمت است　　جوہر اورا کمال از ملّت است
تا توانی با جماعت یار جوش　　رونق ہنگامہ احرار باش

(فرد کے لیے جماعت رحمت ہے۔ اس کی خوبیوں کو ملّت ہی کے ذریعے کمال حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ وابستہ رہو اور آزاد لوگوں کے ہنگامے کی رونق بنے رہو)۔

وہ فرد اور جماعت کے ربط کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرہ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است　　قوتش آشفتگی را مائل است

(فرد جب جماعت میں گم ہو جاتا ہے تو وہ وسعت طلب قطرے کی طرح سمندر بن جاتا ہے۔ تنہا آدمی اپنے مقاصد سے غافل ہو جاتا ہے اور اس کی طاقت انتشار کی طرف مائل ہوتی ہے)۔

وہ کہتے ہیں کہ فرد کی بھرپور توانائی کا اظہار اجتماعیت کے ساتھ ہی پورے طور سے ہو سکتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

وہ مزید کہتے ہیں کہ:

ملّت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ　　پیوستہ رہ شجر سے، اُمید بہار رکھ

وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ رنگ وخون کے بتوں کو توڑ کر ایک ملّت کی شکل میں متحد ہو جائیں۔ کیونکہ یہی ایک صورت ہے جس کے ذریعے ایک زندہ قوم کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ملک، قوم، نسل اور وطن کی مصنوعی حد بندیوں نے نوعِ انسانی کا شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیا ہے اور اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ اسلامی معاشرے کے تصور کو رائج کیا جائے اور کم از کم مسلمان خود کو اسی معاشرے کا حصہ بنالیں:

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی — اُخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بُتانِ رنگ وخوں کوتوڑ کر ملت میں گم ہوجا — نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

وہ مزید کہتے ہیں کہ:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو — اخوت کا بیان ہوجا، محبت کی زباں ہوجا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی — تواے شرمندۂ ساحل! اُچھل کر بے کراں ہوجا
غبار آلودۂ رنگ ونسب ہیں بال وپَر تیرے — تواے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہوجا

وہ انتشار وافتراق کا گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد کہتے ہیں کہ:

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں — یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

وہ مزید کہتے ہیں کہ:

رشتہ وحدت چوں قوم از دست داد — صد گرہ بر روئے کارے ما افتاد
ما پریشان در جہاں چوں اختریم — ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم
باز ایں اوراق را شیرازہ کن — باز آئین محبت تازہ کن

(جب قوم نے اتحاد کا رشتہ چھوڑ دیا تو ہمارے کام میں سیکڑوں گرہیں پڑ گئیں۔ ہم دنیا میں ستاروں کی مانند بکھرے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ ان اوراق کی پھر سے شیرازہ بندی کرو اور محبت کے آئین کو پھر تازہ کرو)۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ:

بتاں شعوب و قبائل کو توڑ — رسومِ کُہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم، یہی فتح باب — کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

وہ ایک دوسرے زاوے سے مزید کہتے ہیں کہ:

ربط وضبطِ ملت بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے　　نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی　　اُڑ گیا دنیا سے تُو مانندِ خاکِ رہ گزر

وہ کہتے ہیں کہ اسلام ایک ازلی، ابدی، آفاقی اور عالم گیر پیغام ہے۔ اس کا مقصد تمام نوعِ انسانی کو اخوت کی لڑی میں پرو کر ایک وسیع تر ملت اسلامیہ کا قیام عمل میں لانا ہے۔ اسلام، ہر قوم اور ہر ملک کے لیے راہِ ہدایت ہے۔ اس لیے اس کے پیروکاروں کو رنگ و نسل اور ملک و وطن کے امتیازات مٹا کر یک جا ہو جانا چاہیے اور دنیائے انسانیت کے لیے ایک عالم گیر برادری کی مثال پیش کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں 'جمعیت اقوام' کی تنظیم پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسانوں کے درمیان اخوت کا جذبہ پیدا ہونا اصل ہے نہ کہ قوموں کا ایک جگہ اکٹھا ہو جانا:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام　　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملّت آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام　　جمعیتِ اقوام کہ جمعیت آدم

علامہ اقبال اتحاد کے لیے اسلامی قومیت کی درست فکر کو لازمی خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی قومیت کی بنیاد اسلام پر ہے۔ ملک و نسب، نسل اور وطن پر نہیں۔ اس تصور کی انھوں نے عمر بھر شد و مد سے تبلیغ کی۔ قومیت کے متعلق نظریات کے حوالے سے اقبال ایک ارتقائی عمل سے گزرے اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ نسل، جغرافیائی، لسانی حوالے سے اقوام کی تقسیم مغرب کا چھوڑا ہوا شوشہ ہے، جس کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کو تقسیم کرنا ہے۔ اس لیے انھوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنے نظریۂ ملت سے ایک ہونے کا پیغام دیا تا کہ مغرب کی ان سازشوں کو ناکام بنایا جا سکے اور مسلمان اقوامِ عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام ایک بار پھر حاصل کر سکیں۔ اس مسئلے میں ان کا ارتقائی عمل بالکل ظاہر و باہر ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں وطن سے ان کی گہری محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے اوّلین اُردو مجموعہ بانگِ درا کا آغاز ایک ایسی نظم سے ہوتا ہے جو حصولِ تعلیم کی غرض سے ان کے یورپ جانے سے قبل لکھی گئی۔ مثلاً اپنی نظم 'تصویرِ درد' میں وہ ہندوستان کی قسمت پر آنسو بہاتے ہوئے کہتے ہیں:

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کرنا داں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے — عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

'ترانہ ہندی' ان کی وہ مشہور اور مقبول نظم ہے جو ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ اس میں انتہائی دل نشین طریقے سے اپنے وطن کے ساتھ گہرے لگاؤ اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہیں ہم بھی، دل ہو جہاں ہمارا

اس زمانے کی ایک اور نظم 'ہندوستانی بچوں کا گیت' ایک ایسی نظم ہے جس کے ایک ایک لفظ سے وطن پرستانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے:

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا — نوحِ نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا
رِفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا — جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اسی طرح اپنی نظم 'نیا شوالہ' میں انھوں نے یہ کہہ کر اپنی وطن پرستی کی انتہا کر دی تھی ؎

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ جوں جوں اقبال فکری ارتقا کے مراحل طے کرتے گئے، ان کے وطن پرستانہ جذبات دھیمے اور ملت پرستانہ جذبات گہرے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وطن کی محبت کے نظریے سے قطعاً کنارہ کش ہو گئے۔ مگر یہ اعتراض بالکل درست نہیں ہے۔ طاہر فاروقی سیرتِ اقبال میں لکھتے ہیں: ''وطنیت کا وہ نظریہ جس کی تبلیغ سیاستِ مغرب کی طرف سے ہوئی ہے، آپ اس کے شدید مخالف ہیں اور اقوام وملل کے حق میں اس کو سمِ قاتل خیال کرتے ہیں۔ لیکن وطنیت کا یہ مفہوم کہ ہندی، عراقی، خراسانی، افغانی، روسی، مصری وغیرہ ہونے کے اعتبار سے ہر فرد کو اپنے وطن ولادت

سے تعلق اور نسبت ہے، اس کے آپ قائل اور معترف ہیں۔''

ان کی پختگی کے دور کی تصانیف جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق اور مثنوی مسافر میں بھی حبِ وطن کے لطیف جذبات کا اظہار جا بجا ہوا ہے۔ جاوید نامہ کا وہ حصہ تو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جہاں انھوں نے میر جعفر اور میر صادق جیسے وطن کے غداروں کو ننگِ آدم، ننگِ وطن قرار دے کر ان کی روحوں کو ایک قدر ناپاک ثابت کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے پر علامہ اقبال نے اپنے ایک مضمون میں حتمی گفتگو کی ہے۔

علامہ اقبال وطنیت کے مسئلے پر مارچ ۱۹۳۸ء کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ: ''میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں، جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریے کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا۔ مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یورپ کی دلی اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب ہوگئی۔ (بحوالہ سیرتِ اقبال)

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں: ''اگر بعض مسلم علما اس فریب میں مبتلا ہیں کہ 'دین' اور 'وطن' اسی تصور کے تحت یک جا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو ہر وقت متنبہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگی، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپروائی۔ (بحوالہ سیرتِ اقبال)

علامہ اقبال وطنیت کو اسلام کی عالم گیر روح کے منافی خیال کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ اس نئے بت کو توڑنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بانگِ درا کی ایک نظم 'وطنیت' جس کا ذیلی عنوان ہے: ''وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے''۔ انھوں نے بڑی وضاحت سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دین نبویؐ ہے
باز و ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے، تُو مصطفوی ہے

وہ کہتے ہیں:

ما مسلمانیم و اولاد خلیل — از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل
اصل ملّت در وطن دیدن کہ چہ — باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازاں شدن نادانی است — حکم او اندر تن و تن فانی است
ملّت ما را اساسِ دیگر است — ایں اساس اندر دل ما مضمر است
حاضریم و دل بغائب بستہ ایم — پس زبند ابن و آں وارستہ ایم
مدّعائے ما، مآل مایکے ست — طرز و انداز و خیال مایکے ست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم — یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

(ہم حضرت ابراھیمؑ خلیل اللہ کی اولاد ہیں۔ اگر تم دلیل چاہتے ہو تو قرآن کی آیت ملّۃ ابیکم ابراھیم سے دلیل حاصل کرو۔ قوم کی بنیاد وطن میں دیکھنا کیسا! ہوا، مٹی اور پانی کو کیا پوجنا! نسب پر فخر کرنا حماقت ہے۔ اس کا تعلق جسم سے ہوتا ہے اور جسم فانی ہے۔ ہماری قوم کی بنیاد دوسری ہے۔ یہ بنیاد ہمارے دل کے اندر پوشیدہ ہے۔ ہم حاضر ہیں لیکن ہم نے دل کو غائب (اللہ تعالیٰ) سے وابستہ کر رکھا ہے۔ پس ہم کسی بھی طرح کی پابندی سے آزاد ہیں۔ ہمارے طور طریقے اور ہمارا خیال ایک ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کی نعمت (اسلام) سے بھائی بھائی بن گئے۔ ہم ایک زبان، ایک دل اور ایک جان ہو گئے)۔

اس کی عملی مثال پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال ایک جگہ کہتے ہیں۔

اسود از توحید احمر می شود — خویش فاروق و ابوذر می شود

(توحید کے ذریعے کالا گورا بن جاتا ہے، یعنی اس کا ہمسر بن جاتا ہے اور حضرت عمر فاروقؓ اور

حضرت ابوذرؓ کا قرابت دار ہو جاتا ہے)۔

وہ مزید کہتے ہیں۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

(ہر ملک ہمارا ملک ہے کیونکہ ہمارے خدا کا ملک ہے)۔

حضرت کعب بن زہیرؓ نے جب 'قصیدہ بردہ' کہا تھا تو انھوں نے اس میں آپؐ کی شان میں یہ شعر بھی کہا تھا کہ:

ان الرسول لنور یستضاء به وسیف من سیوف الله مصلول

(رسولؐ کی ذات بلاشبہ نور کی مانند ہے جس کے ذریعے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور اللہ کی تلواروں میں سے سونتی ہوئی ایک تلوار ہیں)۔

انھوں نے پہلے (سیف من سیوف الھند، ہندوستانی تلواروں میں سے ایک تلوار، اس زمانے میں ہندوستانی تلوار اپنی تیزی اور اچھائی کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھی) کہا، تھا تو آپؐ نے اس کو ناپسند فرمایا اور (سیف من سیوف اللّٰہ، اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کہنے کو کہا۔

علامہ اقبال کہتے ہیں:

جوہر ما بامقامے بستہ نیست بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

صورت ماہی بہ بحر آزاد شو یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

(ہمارا جوہر کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں ہے۔ اس کی سخت شراب کسی ایک جام تک محدود نہیں ہے۔ مچھلی کی مانند سمندر میں آزاد رہو، یعنی کسی مقام کی قید سے آزاد ہو جاؤ)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ہجرت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ درس دیا جائے کہ ان کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ نظریۂ توحید ہے:

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملت گیتی نورد بر اساس کلمۂ تعمیر کرد

قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند　　معنی ہجرت غلط فہمیدہ اند

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است　　ایں ز اسباب ثبات مسلم است

معنی او از تنک آبی رم است　　ترک شبنم بہر تسخیریم است

بگذر از گل گلستاں مقصود تست　　ایں زیاں پیرایہ بند سود تست

(حضور اکرم ﷺ نے مسلم قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ ہمارے آقا محمد ﷺ نے وطن سے ہجرت کی۔ آپ ﷺ کی حکمت نے دنیا میں پھرنے والی قوم کی تعمیر کلمۂ توحید کی بنیاد پر کی۔ قصہ سنانے والوں نے ہم سے حق کو پوشیدہ رکھا اور ہجرت کے معنی غلط سمجھائے۔ ہجرت مسلمان کی زندگی کا دستور ہے۔ یہ مسلمانوں کے ثبات واستحکام کا ایک سبب ہے۔ اس کا مطلب تھوڑے پانی سے گریز اور دریا کی خاطر شبنم کو ترک کرنا ہے، اے مسلماں! پھول کو چھوڑ دے کیونکہ تیرا مقصود تو باغ ہے اور پھول چھوڑنے کا یہ نقصان تیرے فائدے کی خاطر ہے)۔

اسلام حسب ونسب کے حوالے سے تشخص کا قائل ہے نہ کہ تفضّل کا۔ حضرت سلمانؓ سے کسی نے نسب پوچھا تو آپ نے کہا کہ سلمان بن اسلام۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

(ہم نہ افغانی ہیں نہ ترکی اور نہ تاتاری۔ ہم ایک چمن اور ایک شاخسار (اسلام) سے ہیں۔ ہم پر رنگ وبو کی تمیز حرام ہے۔ ہم ایک نئی بہار کے پروردہ ہیں)۔

ایک دوسری جگہ انھوں نے کہا ہے۔

یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو افغان بھی ہو　　تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اتحاد کے لیے ایک مرکز درکار ہوتا ہے اور ہمارا مرکز بیت الحرام ہے:

قوم را ربط و نظام از مرکزے　　روزگارش را دوام از مرکزے

رازدار و راز ما بیت الحرام　　سوز ما ہم سازِ ما بیت الحرام

تو ز پیوند حریمے زندۂ تا طواف او کنی پایندۂ

(قوم ایک مرکز کے ساتھ ہی مربوط اور منظم ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کو مرکز ہی سے دوام حاصل ہوتا ہے۔ ہمارا راز دار اور ہمارا راز بیت الحرام ہے۔ ہماری آرزوؤں اور تگ ودو کا محور بیت الحرام ہے۔ تو بیت الحرام سے وابستگی کے ذریعے زندہ ہے۔ جب تک تو اس کا طواف کرتا رہے گا، قائم رہے گا)۔

علامہ اقبال اتحاد کے لیے وسعتِ نظری کو لازمی خیال کرتے ہیں۔ فقہی وکلامی مباحث میں کشادگی ووسعت کی وکالت کرتے ہیں اور تنگ نظری پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نہ فلسفی سے، نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو یہ دل کی موت، وہ اندیشہ ونظر کا فساد

فقیہ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

ملت اسلامیہ کا اتحاد اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب اس کو صالح اور باشعور افراد میسر ہوں۔ ہر شخص اپنے آپ میں مثلِ انجمن ہو اور انھی سے اسلامی قیادت تشکیل پاتی ہو۔ اس کے لیے علامہ اقبال کا یہ شعر نہایت جامع ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

(بہ شکریہ وحدتِ جدید، بھارت، وحدتِ اُمتِ رسول ﷺ نمبر)

❁❁❁

شمس الرحمٰن فاروقی

اقبالؔ کی شاعری

میرے والد مرحوم کی توجہ اور کوشش کی بدولت مجھے بچپن ہی میں اقبالؔ کے کلام اور پیغام دونوں سے کچھ آشنائی ہوگئی تھی۔ اقبالؔ کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ تو میں شاید اب بھی نہیں کرسکتا، لیکن اقبالؔ سے پوری محبت رکھنے کا دعویٰ میں البتہ کرسکتا ہوں۔ اور اس محبت کو پیدا کرنے، اسے پروان چڑھانے اور قائم رکھنے کے وسائل مہیا کرنے میں میرے شوق و ذوق کا جو کچھ حصہ ہوسکتا ہے، اس سے بہت زیادہ حصہ میرے والد مرحوم کی محنتوں اور شفقتوں کا ہے اور میں ان کے اس احسان پر ہمیشہ فخر کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھ ہیچ کارہ کو اس کا اہل سمجھا۔ اقبالؔ سے میری محبت عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اور اور اگرچہ میں نے ان پر اتنا کچھ لکھا نہیں جتنا کہ چاہتا تھا، اس وقت میری جھولی میں ''اقبالیات'' کے نام سے یہی آٹھ اُردو مضامین اور اتنے ہی انگریزی مضامین ہیں، لیکن میری زندگی کا بڑا حصہ اس طرح کی ادبی فضا تیار کرنے میں صرف ہوا جس میں اقبالؔ سے محبت کرنے کے لیے مسلمان، یا فلسفی یا سیاسی کارکن ہونا ضروری نہ ہو لیکن ادب شناس اور ادب دوست ہونا، بالخصوص اُردو فارسی ادب کا مزاج داں اور مزاج شناس ہونا ضروری ہو۔

اقبالؔ پر میں نے ہمیشہ اپنا کچھ اسی طرح کا حق سمجھا جس طرح کا حق اپنے والد پر سمجھتا تھا، کہ وہ مشکل کے وقت میری دستگیری کریں گے، کوئی مسئلہ پوچھوں گا تو صحیح حل بتائیں گے، بھٹک جاؤں گا تو رہنمائی کریں گے۔ اقبالؔ نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں ورڈزورتھ (William Wordsworth) کی شاعری نے انھیں دہریہ ہونے سے بچالیا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اقبالؔ نے وقتاً فوقتاً مجھے یاس اور بے مصرفی کے قعروں میں غرق ہونے سے بچالیا اور اس کی وجہ ان کا پیغام نہیں بلکہ ان کی شاعری تھی:

وہ حرف راز جو سکھلا گیا ہے مجھ کو جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت

کی زد میں ہے گردوں یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں ان اشعار کے ''معنی'' سے مجھے غرض ہے، لیکن اس قدر نہیں کہ میں ان کی ''شرعی'' یا ''غیر شرعی'' تعبیر میں ہر دم دیوانہ رہوں۔ میں انھیں جتنی بار پڑھتا ہوں مجھے یہ اشعار ہر بار ایک نئی لذت، ایک نیا حوصلہ فراہم کرتے ہیں۔ ہر بار یہ اشعار اپنی روانی، موسیقیت، بلند لیکن دردمندی سے معمور آہنگ، نئے اور نامانوس لفظوں کو انجماد کی سطح سے اٹھا کر ابال اور التہاب کی سطح پر لے آنے کی قوت کے باعث مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں خود کو زندہ سمجھوں اور اس قوت مند، تقریباً الہامی زبان کا زندہ شریک سمجھوں جس میں اس طرح کے شعر ممکن ہو سکتے ہیں۔ لڑکپن میں میرے پاس تنہا ''خضر راہ'' ایک پتلے سے رسالے کی شکل میں تھی۔ سمجھوں یا نہ سمجھوں، لیکن یہ شعر میری روح میں آج بھی ایک خوشگوار تلاطم، ایک لذت خیز سنسنی پیدا کر دیتے ہیں:

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پہ تجھے؟
یہ تگا پوے دمادم زندگی کی ہے دلیل
ریت کے نیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ خضر بے برگ و ساماں وہ سفر بے سنگ میل
وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل
وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

جب ''ضرب کلیم'' میرے ہاتھ لگی تو اس وقت تک ''ضرب کلیم'' کی کچھ نظموں سے متفرق طور پر میں واقف ہو چکا تھا، خاص کر ''شعاع امید'' اور کچھ مختصر منظومات۔ پوری کتاب میں نے 1950 یا 1951 میں دیکھی، اور سب سے پہلے جس چیز نے مجھے متوجہ کیا وہ اس کا ذیلی عنوان تھا:

''اعلانِ جنگ، دورِ حاضر کے خلاف''۔ بات میری سمجھ میں ٹھیک سے نہ آئی۔ اپنے باپ سے میں اس قدر بے تکلف نہ تھا کہ ان سے پوچھتا۔ استادوں کی طرف نظر نہ گئی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا، کیوں کہ اس اعلانِ جنگ کے جو معنی میں نے بالآخر سمجھے وہ شاید میرے استادوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہوتے۔ ہائی اسکول کے بعد اُردو میرے پاس نہ تھی، لیکن اسی زمانے میں یا اس کے کچھ ہی بعد، مجھے

اقبالؔ کے بارے میں مجنوںؔ گورکھپوری کی کتاب ''اقبال، اجمالی تبصرہ'' کی خبر لگی۔ مجھے معلوم ہوا کہ مجنوں صاحب نے اقبالؔ کے ساتھ کچھ زیادتیاں کی ہیں۔ یہ گورکھ پور تھا، جہاں جنوں صاحب کے علم اور ادبی مرتبے کا ڈنکا بجتا تھا اور جہاں کے پڑھے لکھے حلقوں میں انھیں صرف مجنوں صاحب، کہا جاتا تھا ''مجنوں گورکھپوری'' نہیں۔

یعنی ان حلقوں میں مجنوںؔ صاحب کا نام بالکل گھریلو نام تھا۔ فراقؔ صاحب اور مجنوںؔ صاحب دو نامور فرزند گورکھپور کے تھے اور ہر شخص ان سے محبت کرتا تھا۔ میں اس وقت انٹر کے پہلے یا دوسرے سال میں تھا، مجھے ان معاملات کی زیادہ سمجھ نہ تھی، لیکن جب میں نے مجنوںؔ صاحب کی کتاب کسی طرح حاصل کر کے پڑھی تو میں مجنوں صاحب کی نکتہ چینیوں سے کچھ مطمئن نہ ہوا اور اقبالؔ سے میری محبت حسبِ سابق باقی رہی۔

''ضربِ کلیم'' نے مجھے یہ بات بھی سجھائی کہ ''اعلان جنگ'' کے لیے ضروری نہیں کہ شاعر جھنڈا لے کر نعرے لگائے یا بندوق لے کر محاذِ جنگ قائم کرے۔ شاعر کے لیے سب سے اچھی جنگ یہی ہے کہ وہ شاعر اچھا ہو اور اپنے خیالات کو اس طرح ادا کرے کہ جس چیز کو وہ ناپسند کرتا ہو اس کے لیے ہمارے دل میں بھی ناپسندیدگی پیدا کر دے۔ لیکن ہماری گردن تھام کر نہیں، اپنی فنی لیاقت کے ذریعے۔ لیگ آف نیشنز (League of Nations) کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہ تھا، سوا اس کے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا لیکن مغربی سیاست کے ہاتھ میں بالکل بے اثر تھا۔ اقبالؔ کی نظم ''جمعیتِ اقوام'' میں جو طنز اور مغربی اقوام اور سرمایہ دار فوجی نظام کے خلاف جو استحقار ہے اس نے مجھے خود اقبالؔ کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور مغربی سیاست کے بارے میں بھی بصیرت عطا کی:

جمعیت اقوام

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے

ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

یہ الفاظ آج بھی اتنے ہی سچے ہیں جتنے اُس وقت تھے جب اقبالؔ نے انھیں قلمبند کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ نام بدل گیا ہے۔ آج کی یواین او بھی امریکہ کے ہاتھ میں اسی طرح کٹھ پتلی ہے جس طرح کل کی جمعیت اقوام (League of Nations) مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں موم کی ناک جیسی تھی۔ فلسطین کے معاملے میں اسرائیل کے خلاف معمولی سے معمولی تجویز بھی ناکام ہو جاتی ہے کیوں کہ امریکہ اپنا حق استرداد (Veto) بے دھڑک استعمال کرتا ہے۔ اور اگر تجویز منظور بھی ہو جائے تو کون اس کی پروا کرتا ہے، امریکہ کا سایہ اسرائیل کے سر پر ہے۔ عراق پر حملہ کرنا ہو تو اقوام متحدہ کچھ بھی کہتی رہے، امریکہ اور اس کے ہم نوا من مانی کر گزرتے ہیں اور دنیا ٹک ٹک دیکھتی رہتی ہے۔

اقبالؔ کی یہ نظم پہلی بار مجھے میرے والد نے پڑھائی تھی۔ آج اس بات کو سات دہائیاں گزر چکی ہیں لیکن مغربی استعمار کے بارے میں جو کچھ میری فہم ہے اس کا آغاز اسی نظم سے ہوتا ہے۔ مغربی استعمار کا براہ راست تجربہ مجھے 1942ء میں ہوا تھا جب ہندوستان چھوڑو، (Quit India) کی تحریک میں حصہ لینے والوں کے گھروں کو انگریز، حکومت نے دھڑا دھڑ جلا کر خاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ نہ کوئی مقدمہ، نہ جرح، نہ عدالت، بس گھر کے گھر نذرِ آتش ہو رہے تھے اور ان کے مکین بے بس دیکھ رہے تھے۔ اس وقت یہ باتیں میرے لیے اندوہ ناک اگرچہ سنسنی خیز حادثے تھیں، لیکن ان کے پیچھے سیاست کیا ہے اور کیوں ہے، یہ مجھے اقبالؔ ہی نے بتایا، لیکن سیاسی پروپیگنڈے یا تبلیغ و تلقین کے ذریعے نہیں۔ اس نظم کی طباعی، لہجے کی تیزی اور بین الاقوامی سیاست کے مکمل شعور اور اس کی چالبازیوں کے لیے گہرے جذبہ حقارت نے اس نظم کو وہ قوت دے دی ہے کہ یہ فوراً دل اور دماغ میں اُتر جاتی ہے۔

اقبالؔ کا سب سے بڑا کمال میری نظر میں یہی ہے کہ وہ شاعر کے منصب کو پوری طرح نبھاتے ہیں۔ ترقی پسند شعرا اس باب میں ان کی تقلید کرنے سے ناکام رہے یا وہ اس کام کی اہلیت ہی نہ رکھتے تھے۔ اقبالؔ کے سوا کوئی شاعر مجھے پوری بیسویں صدی میں ایسا نظر نہیں آتا جو ڈبلیو بی ایٹس (W. B. Yeats) کی طرح سیاسی موضوعات کو شاعری میں بدل دیتا ہو، لیکن یہ محض اتفاق ہے کہ اس وقت جو نظم یہاں زیر بحث آ گئی ہے وہ سیاسی شاعری کے شاہکاروں میں شمار ہونے کے لائق ہے ورنہ اقبالؔ

کے یہاں ایسی نظمیں بہت ہیں جن سے ہم شعر کی سطح پر لطف اندوز ہوتے ہیں اور اکثر تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے سیاسی خیالات ہمیں متاثر نہیں کرتے، لیکن نظم پھر بھی کامیاب رہتی ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی نظم 'فرمانِ خدا (فرشتوں سے)' اُس کی مثال ہے۔ اس میں خیالات معمولی اور سرسری ہیں، لیکن نظم پھر بھی قوت اور لطف سے خالی نہیں۔ اگر سیاسی مضمون پر انتہائی کامیاب اور خیال کی سطح پر بے حد بلند نظم کی مثال دیکھنی ہو تو 'لینن خدا کے حضور میں' ملاحظہ کریں۔ اس نظم میں ایک بڑی بات تو یہ بھی ہے کہ اقبالؔ کے آسمانی اور ہمہ گیر تخیل نے حسب معمول دو دنیاؤں کو یکجا کر کے ڈرامائی مکالمے کی صورت میں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ دنیاوی، سیاسی، احتجاجی باتوں کو شعر کے قالب میں یوں ڈھالتے ہیں کہ شعر کا اثر پہلے ہو اور غیر شعری باتوں (یعنی شعر کے دنیاوی مافیہ) کا اثر بعد میں۔

اقبالؔ کے فارسی کلام سے میری واقفیت اُردو کلام کے بہت بعد ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے۔ فارسی میں نے بہت بعد میں پڑھی۔ اور وہ بھی زیادہ تر اپنے شوق سے پڑھی۔ لیکن ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں نے 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' کا ذکر پہلے سنا، 'زبورِ عجم' اور جاوید نامہ' کا بعد میں۔ اقبالؔ کی فارسی شاعری ان کو 'شاعر' سے زیادہ 'فلسفی' ثابت کرنے کے لیے زیادہ استعمال کی گئی ہے اور میں شاعری کو فلسفہ یا تاریخ یا سیاست سے بڑی حد تک مختلف اور برتر سمجھتا چلا آ رہا تھا، لہذا میں نے 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی' کی طرف شروع شروع میں توجہ نہ کی۔ مدتوں بعد جب فارسی کا ذوق مجھ میں اچھی طرح سرایت کر چکا تھا، تب میں نے اقبالؔ کا فارسی کلام پڑھا اور اس کے بارے میں یہی رائے قائم کی کہ شاعرانہ کمال کے اظہار کی حیثیت سے اقبالؔ کے فارسی کلام اور اُردو کلام میں کوئی فرق نہیں، بجز اس کے کہ ان کے فارسی کلام میں ایسے بھی اسالیب ملتے ہیں (مثلاً 'زبورِ عجم' میں) جو اُن کی اُردو شاعری میں نہیں ہیں۔ لیکن اقبالؔ کی اُردو شاعری سے میری محبت جو روزِ اوّل سے قائم ہوئی تھی، فارسی نے اس میں کمی نہ پیدا کی۔ اقبالؔ کی اُردو شاعری سے میرا عشق اب ساٹھ برس سے زیادہ پرانا ہے اور اب اس میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اقبالؔ کے بارے میں انگریزی، اُردو میں جو کچھ لکھا ہے اس میں ان کی فارسی شاعری کا ذکر خال خال ہی آپ کو نظر آئے گا۔ ممکن ہے آئندہ کبھی اس کوتاہی کی تلافی ہو سکے۔

اقبالؔ کی فارسی شاعری کے بارے میں کوئی لکھے یا نہ لکھے، اقبال اس سے مستغنی اور بالاتر ہیں۔ میں کلیم الدین احمد کی اس بات سے بالکل اتفاق نہیں کرتا کہ اقبال بڑے شاعر نہیں ہیں کیوں کہ دنیا کی

بڑی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں میں اقبالؔ کا ذکر نہیں ہوتا۔ اس حساب سے تو اقبالؔ ہی کیا، کسی بھی عربی، فارسی، سنسکرت، چینی، جاپانی، ادیب کو دنیا کے بڑے ادیبوں کی فہرست میں نہیں شامل کیا جاسکتا۔ اب رہا نوبل انعام، تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کی قدر کتنی مشکوک ہے۔ جب دنیا کے بڑے علمی اور تعلیمی ادارے مشرقی ممالک میں ہیں ہی نہیں اور جو ہیں بھی تو وہ مغربی ہی نقطۂ نظر کے حامل ہیں، تو یہ استدلال بے کار اور بے معنی ہے کہ ان اداروں میں اقبالؔ کا ذکر نہیں، لہذا اقبالؔ بڑے شاعر نہیں ہیں۔ کسی شاعر کی بڑائی سب سے پہلے خود اس کی اپنی ادبی تہذیب کے معیاروں پر جانچی جاتی ہے، پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ غیر تہذیبوں میں جن لوگوں کو بڑا شاعر کہا جاتا ہے ان کے تناظر میں ہمارے شاعر کو کہاں رکھا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں معائیر کے حساب سے اقبالؔ بڑے شاعر ٹھہرتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی دھیان میں رکھیے کہ دنیا میں چند ہی مصنف ایسے ہیں جنھوں نے دو زبانوں میں یکساں اعلا مرتبے کا تخلیقی کام کیا ہو۔ ہمارے زمانے میں سیموئل بیکیٹ (samuel Becket) گزشتہ صدی کے شروع میں اقبالؔ اور ٹیگور، انیسویں صدی میں غالبؔ یہی چند نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ لیکن اقبالؔ نے کئی ادبی تہذیبوں اور فکر انسانی کے کئی علاقوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ٹیگور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میری تہذیبی شناخت میں بنگال، اسلام اور انگریزی ادب، یہ تینوں یکساں حصہ دار ہیں۔ اقبالؔ کی تہذیبی شناخت میں سنسکرت، فارسی، عربی، جرمنی، اور عمومی طور پر انگریزی کی ادبی اور فکری روایات شامل ہیں۔ اُردو اور پنجابی ان پر مستزاد ہیں۔ پھر علوم کو لیجیے تو فلسفہ، الٰہیات، تصوف، قانون، ادب، اقتصادیات، سیاسیات، یہ سب اقبالؔ کے خریطے میں ہیں۔ ایسے شاعر کی فکری توانائی اور ادیبانہ تونگری کا بھلا کچھ ٹھکانہ ہوگا؟

(ماخوذ از دیباچہ، خورشید کا سامانِ سفر، 2012ء)

❁❁❁

عالیجناب سید خلیل اللہ حسینی
صدر کل ہند تعمیرِ ملت

اپنی خودی پہچان

انسان قدرت کا شاہکار ہے۔ یوں تو اس کائنات کی ہر مخلوق قدرت پروردگار کا حسین نمونہ ہے۔ لیکن اپنی ان رنگینیوں اور بوقلمیوں کے ساتھ آخر یہ کائنات کس کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ تارے کیوں چمکتے ہیں، پھول کیوں کھلتے ہیں، بادل پانی کس کے لئے لاتے ہیں اور زمین کس واسطے سُونا اُگلتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے سوچئے؟۔ کہ انسان اس دنیا میں نہیں تو بھی کائنات کی کسی مصروفیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ چشمے اُبلتے رہیں گے، پرند چہچہاتے رہیں گے، ساری کائنات اپنے وظیفہ حیات میں مصروف رہے گی۔ اب تھوڑی دیر کے لئے سوچئے انسان تو موجود ہے لیکن یہ دنیا کا کارخانہ مطل ہوگیا ہے۔ بادل برستے نہیں، فصل اُگتی نہیں، پھل لگتے نہیں، ہوا چلتی نہیں، سورج چمکتا نہیں تب اندازہ ہوگا کہ انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا انسان اس کائنات کے لئے نہیں بلکہ یہ ساری کائنات انسان کے لئے ہے۔ انسان کی خادم ہے اور خدمت گار ہے انسان سے کمتر ہے، فروتر ہے۔ انسان کی ضروریات پوری کرنے کیلئے بنائی گئی ہے۔

اکثر انسان اس مقام پر دھوکا کھا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کائنات کی جبّار و قہار قوتوں کا محکوم سمجھتا ہے۔ کائنات کی کسی قوت کو اپنا محسن سمجھتا ہے اور کسی قوت سے ڈرتا ہے۔ دریاؤں کی فیض رسانی سے متاثر ہوکر دریا کے شاہانہ وقار بہاؤ، اور طغیانی اور تباہی ان سب چیزوں کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں دریاؤں سے کمتر ہوں، ادنیٰ ہوں، میں ان اشیائے کائنات کا حاکم نہیں محکوم ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ دنیا، اس کی لطافتیں اور شان و شوکت انسان کے مقصدِ حیات بن جاتے ہیں۔ وہ دولت کے لئے، اقتدار کے لئے، حُسن کے لئے جیتا ہے اور ان چیزوں کے حصول کے لئے سب کچھ کر گذرتا ہے۔ اور اکثر اعلیٰ اخلاقی اصولوں کو بھی، بلند انسانی قدروں کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ آج مغربی تہذیب کا یہ حال سب کے سامنے ہے کہ ہر شخص گلوتراش مسابقت میں مصروف ہے۔ وہ دوسروں کے گلے کاٹنے کی پرواہ نہیں کرتا بس یہ چاہتا ہے کہ دنیا مل جائے، روپیہ مل جائے، اقتدار مل

جائے اور زندگی کا عیش نصیب ہو جائے تا کہ وہ زندگی کے دامن سے مسرت کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان خود غرض ہو جاتا ہے، اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ دوسروں کی تکلیف، دکھ درد اور مصیبت اُس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہندوستان کے اخبارات میں ایک مرتبہ یہ سوال اُٹھایا گیا تھا کہ اگر ایک مقام کو آگ لگ جائے اور صورتِ حال یہ ہو کہ جلتے ہوئے کمرے میں صرف دو ہی چیزیں قابلِ فکر ہوں۔ ایک شیر خوار بچہ اور ایک بہترین آرٹ کا نمونہ۔ اب اگر بچانے والا فرض کیجئے کہ کسی ایک چیز کو بچا سکتا ہے تو سوال یہ ہے کہ کس کو بچائے۔ بچے کو یا آرٹ کے نمونے کو۔ اکثر لوگوں نے یہ رائے دی کہ آرٹ کے نمونے کو بچایا جائے کیونکہ وہ پھر مل نہیں سکتا۔ جہاں تہذیب اس حد تک غیر انسانی ہو جائے، انسانی عظمت اور احترامِ آدم اس مقام پر پہنچ جائے تو وہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے خود کو بُھلا کر حیوانیت کی سطح قبول کر لی ہے۔

یہ سب کچھ اس نقطۂ نظر کو قبول کر لینے کا نتیجہ ہے کہ یہ دنیا، اس کا حُسن، روپیہ اور اقتدار مقصودِ بالذّات ہے۔ اس طرح انسان اس بات کو بھلا دیتا ہے کہ کائنات کا مقصود وہ ہے نہ کہ اس کا مطلوب کائنات۔

انسانی جسم کے کسی عضو پر نظر ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ انسان قدرت کا شاہکار کیوں ہے۔ عقل و حافظہ، فکر کی۔ صلاحیت، سماعت و بصارت، قلبِ حساس، اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو مجموعی طور پر کسی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتیں۔ لیکن کائنات کا یہ سرتاج، خدا کا نائب اپنے مقام کو کم پہچانتا ہے۔ وہ شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو گرا لیتا ہے۔ دھوکا، فریب، چھچھورا پن، ظلم و ستم، منافرت، چاپلوسی، غرض کہ کتنی ہی غیر انسانی اور غیر اخلاقی کیفیت کا شکار رہتا ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے خدا سے سوال کیا تھا ع

یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا؟

گویا امکانی طور پر انسان عظمتوں کے اس مقام کو چُھو سکتا ہے جہاں وہ مسجودِ ملائک بن جاتا ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے کہا کہ انسان کے ہاتھ میں ہے کہ وہ نوری بنے یا ناری بنے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

❁❁❁

بیت بازی (اقبالؔ کے اشعار پر مبنی) کے مقابلہ میں حصہ لیتے ہوئے طالبات۔ پروفیسر فاطمہ پروین، جناب ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی جناب رحیم الدین خان صاحب معتمد انجمن ترقی پسند، پروفیسر مجید بیدار اور سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی۔

حکم کے فرائض انجام دیتے ہوئے پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، جناب محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی، جناب رحیم خان صاحب (صدر اجلاس)، پروفیسر مجید بیدار اور سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی۔

مختلف اسکولوں اور جونیر کالج کے طلباء وطالبات علامہ اقبال کے اشعار پرمبنی بیت بازی مقابلوں میں شرکت کرتے ہوئے۔

بشیر اینڈ سرور بابو خان ٹرسٹ کے تعاون سے منعقدہ فکر وسوانح اقبال پر منعقدہ تقریری مقابلہ میں حصہ لینے والے طلباء اور طالبات۔

اقبال اکیڈیمی کا خبر نامہ

سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد
کے یوم پیدائش پر تقریری مقابلے

حیدرآباد۔ 16/اکتوبر 2014ء (راست) جناب محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے کہا کہ ہر سال سرسید، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ایام پیدائش کے موقع پر (علی الترتیب 18/اکتوبر، 9/نومبر اور 11/نومبر) نئی نسل کو ان کی خدمات سے روشناس کرانے کیلئے تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ سرسید، علامہ اقبال اور مولانا آزاد کا شمار برصغیر کی عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ان زعمائے ملت نے نہ صرف مسلمانان ہند کو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد کرایا بلکہ ان کو نئے عزم اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان کی انتھک کوششوں سے ہندوستان آزادی اور خود مختاری کی منزل تک پہنچا۔ آج کے حالات میں ضروری ہے کہ ملک کے ان اکابر کے افکار اور کارناموں سے ساری قوم بالعموم اور نئی نسل بالخصوص کامل آگاہی حاصل کرے۔ مذکورہ اکابرین کے کارنامے کسی تشریح کے محتاج نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملت کے نوخیز ذہن نہ صرف اپنے محسنوں کی خدمات سے واقف ہوں بلکہ اپنے ملی شعور کی تربیت میں ان کے افکار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں۔ وقت کے تقاضوں کی تکمیل کیلئے جناب محمد ضیاء الدین نیر نے تمام ہائی اسکول، جونیر کالجس اور ڈگری کالجس کے ذمہ داروں سے اپیل کی ہے کہ طالب علموں کیلئے ان عظیم شخصیتوں سے متعلقہ موضوعات پر تقریری، تحریری اور کوئز مقابلے منعقد کئے جائیں۔ ہر سال کی طرح اقبال اکیڈیمی، بشیر اور سرور بابو خان ٹرسٹ کے تعاون سے طلباء کے درمیان انعامی مقابلہ جات کا انعقاد عمل میں لاتی ہے۔ ان مقابلوں میں حصہ لینے کے خواہشمند طلباء رجسٹریشن اور دیگر تفصیلی معلومات کیلئے معتمد مقابلہ جناب عبدالحکیم سے فون 9440378808 پر یا جناب محمد انور سے فون 8712814354 پر ربط پیدا کر سکتے ہیں۔

اقبال اکیڈیمی اور سرور بابو خان ٹرسٹ کے
زیر اہتمام انعامی مقابلے

حیدرآباد۔ 16/اکتوبر 2014ء (پریس نوٹ) محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال

اکیڈیمی نے کہا کہ ہمارے ہاں اپنے محسنوں کو یاد رکھنے کی روایت رہی ہے۔ چنانچہ ہر سال ہم سرسید، علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کی ایام پیدائش کے موقع پر (علی الترتیب 18/اکتوبر، 9/نومبر اور 11/نومبر) نئی نسل کو ان کی خدمات سے روشناس کرانے کیلئے تقاریب کا اہتمام کرتے ہیں۔ سرسید، علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کا شمار برصغیر کی عظیم شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ ان زعمائے ملت نے نہ صرف مسلمانان ہند کو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد کرایا بلکہ ان کو نئے عزم اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان کی انتھک کوششوں سے ہندوستان آزادی اور خود مختاری کی منزل تک پہنچا۔ آج کے حالات میں ضروری ہے کہ ملک کے ان اکابر کے افکار اور کارناموں سے ساری قوم بالعموم اور نئی نسل بالخصوص کامل آگاہی حاصل کرے۔ نیر نے کہا کہ مذکورہ اکابرین کے کارنامے کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملت کے نوخیز ذہن نہ صرف اپنے محسنوں کی خدمات سے واقف ہوں بلکہ اپنی ملی شعور کی تربیت میں ان کے افکار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں۔ وقت کے تقاضوں کی تکمیل کیلئے محمد ضیاء الدین نیر نے تمام ہائی اسکولس، جونیر کالجس اور ڈگری کالجس کے ذمہ داروں سے اپیل کی ہے کہ طالب علموں کیلئے ان عظیم شخصیتوں سے متعلقہ موضوعات پر تقریری، تحریری اور کوئز مقابلہ منعقد کئے جائیں۔ ہر سال کی طرح اقبال اکیڈیمی، بشیر اور سرور بابو خان ٹرسٹ کے تعاون سے طلباء کے درمیان انعامی مقابلہ جات کا انعقاد عمل میں لاتی ہے۔ ان مقابلوں میں حصہ لینے کے خواہشمند طلباء، رجسٹریشن اور دیگر تفصیلی معلومات کیلئے معتمد مقابلہ عبدالحکیم سے سل نمبر 9440378808 اور محمد انور سے سیل نمبر 8712814354 پر ربط قائم کریں۔

لالۂ طور (پیام مشرق) کے اردو منظوم ترجمہ پر مباحثہ

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام پروفیسر خالد سعید کے ترجمہ کردہ لالۂ طور کے فارسی قطعات پر ایک مباحثہ منعقد ہوا۔ تقریب کی صدارت ممتاز شاعر مضطر مجاز نے کی۔ جناب مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر رؤف خیر اور پروفیسر اشرف رفیع نے مباحثہ میں حصہ لیا۔ جناب سید امتیاز الدین نے ابتداء میں کچھ منتخب قطعات اور خالد سعید کا ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ جلسہ کا آغاز محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی نے کلام اقبال پیش کیا۔

ڈاکٹر رؤف خیر نے مباحثہ کی ابتداء کرتے ہوئے کہا کہ لالۂ طور کا ترجمہ خالد سعید کی اچھی کوشش ہے۔ اس سلسلہ میں احمد جاوید کا نثری ترجمہ اور مضطر مجاز اور رفیق خاور کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ کئی ترجمے پاکستان میں بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے خود اپنے ترجمہ کا حوالہ بھی دیا۔ عام طور پر مترجم کی خواہش رہتی ہے کہ اس کا ترجمہ دوسرے مترجم کے مقابلہ میں بہتر ہو۔ فیض احمد فیض نے بھی کچھ ترجمے کئے ہیں۔ خالد سعید نے کہیں کہیں اقبالؔ کی بحر سے انحراف کیا ہے۔ مصحف اقبال توصیفی نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ رموز بے خودی اور پیام مشرق کا دیباچہ خود اقبال نے لکھا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض وضاحتیں وہ ضروری سمجھتے تھے۔ ترجمہ مشکل فن ہے جس کے لئے مترجم کو ہر دو زبانوں پر عبور ضروری ہے۔ پیام مشرق میں اقبالؔ نے گوئٹے کے کلام کا جواب دیا ہے۔ انہوں نے مشرق کے باطن کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ خالد سعید کی تخلیقی اٹھان اس ترجمے سے ظاہر ہے۔ محترمہ اشرف رفیع نے ترجمہ کی ستائش کرتے ہوے کہا کہ لالۂ طور میں اقبالؔ نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ خالد سعید کے مزاج میں توازن ہے۔ ترجمہ سلیس زبان میں ہے۔

خالد سعید نے مبصرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اب تک جو ترجمے ہوئے ہیں اُن میں کہیں کچھ کم ہے اور کہیں کچھ زیادہ ہے۔ انہوں نے ترجمہ میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ لفظی ترجمہ بھی ہو، بامحاورہ بھی ہوا اور اقبالؔ کے مرکزی خیال کی ترجمانی بھی ہو جائے۔ ترجمہ میں اپنی محنت کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے اعتراف کیا کہ بعض قطعات کا انہوں نے پانچ چھ بار ترجمہ کیا تب جا کے وہ مطمئن ہوئے۔ صدر جلسہ مضطر مجاز نے تراجم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ افلاطون اور ارسطو سے لے کر اقبالؔ تک نادر شہ پارے ہم تک ترجمہ کے وسیلہ سے پہنچے ہیں۔ اقبال نے زبان پر بھی بڑی محنت کی ہے۔ انہوں نے اپنی پیامی شاعری کو زبان و بیان اور اسلوب سخن سے حسن عطا کیا ہے۔ آورد کو آمد میں تبدیل کرنا ترجمہ کا کمال ہے۔ انہوں نے کہا کہ گورِ غریباں نظم طباطبائی کا عمدہ کارنامہ ہے۔ اس میں شعریت باقی ہے۔ انہوں نے خالد سعید کی کوشش کو سراہا۔ جلسہ میں صدر اقبال اکیڈیمی جناب ظہیر الدین اور جناب عمر علی خان صدر اسلامک ہیریٹج فاؤنڈریشن کے علاوہ باذوق سامعین شریک تھے۔ جناب ضیاء الدین نیر کے شکریہ پر یہ محفل اختتام کو پہنچی۔

حضرت کلیم عاجز کے اعزاز میں
اقبال اکیڈیمی کی ادبی نشست

پریس نوٹ: حضرت کلیم عاجز ایک کتاب کی رسم اجراء کے سلسلے میں مختصر سے قیام کیلئے حیدرآباد آئے تھے۔ ان کے اعزاز میں اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام ایک شعری نشست ترتیب دی گئی۔ کلیم عاجز صاحب کی گلشن خلیل مانصاحب ٹینک میں تشریف آوری پر محمد ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے اکیڈیمی کی سرگرمیوں اور مطبوعات کے تعلق سے انہیں واقف کروایا اور صدر اقبال اکیڈیمی محمد ظہیر الدین احمد صاحب کی کتاب ''چند قدم اقبال کے ساتھ'' کا ایک نسخہ پیش کیا۔ جناب محمد عمر علی خان صدر اسلامک ہیریٹج فاؤنڈیشن نے معزز مہمان کی گل پوشی کی۔ سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ کلیم عاجز صاحب نے اقبال اکیڈیمی کی سرگرمیوں کو سراہا اور کتب خانہ میں نادر و نایاب کتابوں کی موجودگی پر اظہار مسرت کیا۔

اس مختصر شعری نشست میں مضطر مجاز، پروفیسر عقیل ہاشمی، ڈاکٹر یوسف اعظمی اور سید امتیاز الدین نے کلام سنایا۔ حضرت کلیم عاجز نے اپنے مخصوص اور منفرد رنگ میں تین غزلیں پیش کیں۔ ان کے اس شعر پر سامعین نے انہیں بے حد داد دی۔

لہو کی مئے، صراحی گردنوں کی، جام زخموں کے
یہ کس قاتل نے کھلوایا ہے یہ مئے خانہ کس کا ہے

سامعین میں پروفیسر فاطمہ پروین، افتخار حسین فدا علی، عبد المقیت، ابوبکر صدیقی، قاضی زین العابدین، احمد انمول، محمد عمر، محمد اشفاق اور دیگر حضرات شریک تھے۔

علامہ اقبالؔ کی ۱۳۷ ویں یوم ولادت کے موقع پر

علامہ اقبالؔ کی ۱۳۷ ویں یوم ولادت کی مناسبت سے اقبالؔ اکیڈیمی نے بشیر اینڈ سرور بابو خان ٹرسٹ کے تعاون سے طلباء اور طالبات میں علامہ اقبالؔ کے اشعار پر مبنی بیت بازی اور تقریری مقابلوں کا انعقاد عمل میں لایا۔ ان مقابلوں کا انعقاد جناب رحیم الدین خان صاحب معتمد

انجمن ترقی اردو ہند کی صدارت میں ہوا۔ پروفیسر فاطمہ پروین صاحبہ' پروفیسر مجید بیدار صاحب (سابق صدور شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) اور سید امتیاز الدین معتمد اقبال اکیڈیمی نے حکم کے فرائض انجام دیئے۔ ۳۵ اردو میڈیم اور ۱۴ انگلش میڈیم اسکولس کے جملہ (۲۵۰) دوسو پچاس طلباء وطالبات نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ بیت بازی مقابلوں میں فوکس (Focus) ہائی اسکول دارالشفاء کی ٹیم کو انعام اول کا مستحق قرار دیا گیا۔ انعام دوم اقراء مشن ہائی اسکول نواب صاحب کنٹہ کی ٹیم نے حاصل کیا۔ سینٹ معاذ ہائی اسکول' اشرفیہ ہائی اسکول ملک پیٹ اور ماؤنٹ مری ہائی اسکول ٹولی چوکی انعام سوم کے مستحق قرار پائے۔ جبکہ گورنمنٹ ہائی اسکول چنچل گوڑہ' گورنمنٹ ہائی اسکول مغل پورہ اور میسکو گریڈ ہائی اسکول ملک پیٹ ترغیبی انعامات حاصل کئے۔ تقریری مقابلوں میں ماؤنٹ مری ہائی اسکول کی طالبہ آنسہ رابعہ بانو نے انعام اول حاصل کیا۔ فوکس ہائی اسکول دارالشفاء کے طالب محمد حماد الدین نے انعام دوم حاصل کیا۔ انعام سوم کے لئے آنسہ روحی فردوس (اقراء مشن ہائی اسکول)' آنسہ آمنہ سلطانہ (میسکو گریڈ ملک پیٹ) اور آنسہ ثمرین فاطمہ (نیو ماڈل ہائی اسکول دودھ باؤلی) منتخب ہوئے۔ تقریری مقابلوں میں ترغیبی انعامات کیلئے آنسہ ثنا تبسم (معظم جاہی گرلز ہائی اسکول)' آنسہ بتول فاطمہ (سینٹ ہل ہائی اسکول چندرائن گٹہ)' آنسہ خدیجہ بانو (ایم ایس کریٹیو اسکول)' اسحٰق خان (گورنمنٹ ہائی اسکول درگاہ برہنہ شاہ اور امجد رضا (مدینہ اسلامک مشن ہائی اسکول مغل پورہ) منتخب قرار دیئے گئے۔ صدر اجلاس جناب رحیم الدین خالد صاحب اور حکم صاحبان نے طلباء وطالبات کی غیر معمولی دلچسپی کو سراہا۔ مدراس کے انتظامیہ اور اولیاء طلباء کی اپنے ورثہ کو نونہالوں کی منتقل کرنے کے جذبہ کی ستائش کی۔ نگران جلسہ جناب ضیاء الدین نیر نے کہا کہ نوجوان ہمیشہ اقبال کی امیدوں کا ان کی فکر میں نوجوانوں کی تربیت کو خاص مقام حاصل ہے۔ اسپرنگ فیلڈ اسکول کے انتظامیہ اور تمام حاضرین کے شکریہ پر مقابلوں کا اختتام عمل میں آیا۔ انعام یافتگان میں رقمی انعامات کی تقسیم اقبال اکیڈیمی (گلشن خلیل ماں صاحب ٹینک حیدرآباد) میں 9/جومبر 2014ء بروز یکشنبہ 6 ساعت شام عمل میں آئی۔

☆☆☆

Vol : 24 Issue : 2
November 2014

ISBN: 81-86370-63-3

(JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY HYDERABAD)

IQBAL REVIEW

NOVEMBER 2014

IQBAL ACADEMY
Gulshan-e-Khaleel, Masab Tank,
Hyderabad - 28, A.P. INDIA.